سوئے انشائیہ
اور
سوانحی انشائیے

قدیر زماں

فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر
16-10-49 ملک پیٹھ حیدرآباد۔36

محبّی وہاب عندلیب

کے نام

Soo-e-Inshaiya aur Sawanehi Inshaiye
Kadir Zaman

نام کتاب : سوئے انشائیہ اور سوانحی انشائیے
مصنف : قدیر زماں
سال اشاعت : مارچ 2009ء
قیمت : -/250 روپے ٗ بارہ ڈالر
ناشر : فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر
کمپیوٹر کتابت : ممتاز کمپیوٹرس ٗ شاہ گنج ٗ حیدرآباد سیل :9848615340

Printed at :

Al-Ansar Publications

18-8-223/12/A, Riyasat Nagar, Hyd-59.
Cell : 9391301192

ملنے کا پتہ : 16-10-49 ملک پیٹھ ٗ حیدرآباد۔500036
دارالکتاب ٗ گن فاؤنڈری ٗ حیدرآباد۔1
سب رس کتاب گھر ٗ پنجہ گٹہ ٗ حیدرآباد

ISBN 81-900-859-8-0

یہ کتاب آندھراپردیش اُردو اکاڈمی کی جزوی مالی اعانت سے شائع ہوئی

فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر

16-10-49 ملک پیٹھ ٗ حیدرآباد۔500036

فہرست

عرضِ مصنف

زیرِ نظر کتاب میری پچھلی کتاب ''بزم اربابِ نظر'' (۲۰۰۷ء) کا تسلسل ہے۔ ان میں قلم بند کئے ہوئے مضامین کو میں نے ''سوانحی'' انشائیے کہا ہے۔ خاکے اس لئے نہیں کہا کہ میں مزاح نگار نہیں ہوں اور اس لئے بھی کہ ان میں انشائیہ کی صفات ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ تمام کے تمام انشائیے نہیں ہیں۔ تخیل آمد کا مرہون منت ہوتا ہے۔ اکثر مضامین بیانیہ کے متقاضی تھے۔ جس طرح قلم چل پڑا میں نے اُسی کو روا رکھا۔ کسی مضمون کا شروع سے آخر تک محاوروں، کہاوتوں اور تخیل سے پُر ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ یہ تینوں کہیں کہیں موجود ہوں اور زبان میں فصاحت و بلاغت ہو، تشبیہات، استعاروں اور تلازموں کا استعمال بھی ہو، مضمون طنز اور جھوٹ سے عاری ہو، مقصد قصہ گوئی یا افسانہ نگاری نہ ہو تو ایسے مضمون کو میں انشائیہ ہی قرار دینا پسند کروں گا۔ خاکہ نگاری میں طنز و مزاح کے ساتھ کرداروں کو ہدفِ ملامت بنانے کا رجحان بھی ہوتا ہے۔ میں نے جن احباب پر قلم اٹھایا ہے ان کا میں مداح ہوں۔ ان احباب سے میں نے علم و ادب، تہذیب و ثقافت کے شعبوں میں اکتساب کیا ہے۔ جو خامیاں میں نے ان میں پائیں ان سے زیادہ خامیاں میں اپنے میں پاتا ہوں۔ خوبیوں کے اظہار کو اس لئے ضروری سمجھا کہ دیے سے دیا جلتا ہے۔ انسان جس مثالی (Ideal) معاشرہ کا تصور کرسکتا ہے وہ تو ابھی تک کہیں قائم نہ ہوسکا۔

میرے اور بھی کئی ایسے احباب ہیں جن کا مجھ پر قرض ہے۔ میری اپنی کوتاہیاں کہ میں اس سے پوری طرح عہدہ برآ نہ ہوسکا۔

یہ بھی عرض کردوں کہ اپنے ممدوحین کے سوانحی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اپنے بعض شخصی واقعات بھی تحریر کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ کہیں غیر ضروری محسوس ہوتے ہیں تو اس کا سبب وقت کا جبر ہے جو اپنے دور کو منوانے کا ہے۔ اپنے اس جبر سے وہ باخبر ہو کہ نہ ہو ہم اس قدر جانتے ہیں کہ وہ لامتناہی ہے اور خود اپنے ان ہی واقعات کی نشانی چھوڑ جاتا ہے جو سیاروں کی شکل میں کائنات پر حاوی ہیں۔ باقی ہوس ہے، جس کی لگن پر ہم زندہ ہیں۔

قدیر زماں

حیدرآباد جنوری ۲۰۰۹ء

انشائیہ اور مضمون (Essay) کے امتیازات

(یہ مضمون شعبہ اردو حیدرآباد یونیورسٹی کے سمینار "اردو انشائیہ ـــ روایت اور امکانات" منعقدہ مارچ ۲۰۰۸ء میں پڑھا گیا۔ چند اضافوں کے ساتھ یہاں شامل ہے)

اس وقت میں مشکل میں پڑ گیا ہوں کہ اپنی بات کو کس طرح شروع کروں۔ انگریزی میں (Essay) ''ایسے'' تو مضمون اور انشائیہ دونوں ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اردو میں ایسا نہیں ہے اس لیے میں لغات کا سہارا لے کر ان الفاظ کی تشریح کردیتا ہوں تاکہ میرا مسئلہ کچھ تو آسان ہوجائے۔ لغات میں ''انشاء'' کے معنی ہیں ''عبارت'' ''طرز تحریر'' ''بات میں بات پیدا کرنا''، ''مضمون'' کے لئے کہا گیا ہے ''مطلب''، ''معنی''، ''بیان''، ''بات''، ''اداریہ'' اور اگر عبارت ہی کہنا مقصود ہے تو اس کے لیے بھی وہی الفاظ ہیں جو مضمون کی جگہ استعمال ہوتے ہیں ''مدعا'' اور ''مراد'' کا اضافہ ہے۔ تحریر کو بھی عبارت ہی کہا گیا ہے۔ اور ساتھ میں ''تصنیف'' ''تالیف'' اور ''دستاویز'' کا مزید اضافہ ہے۔ گویا یہ تینوں اصطلاحیں مضمون، عبارت اور تحریر ایک ہی طرح کا مفہوم رکھتی ہیں۔ البتہ انشائیہ کے لئے فعل متعدی کا مفہوم بھی دیا گیا ہے۔ انشائیہ لکھنے کے لیے فن کار کے لئے ضروری ہے کہ اپنی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لائے۔ اس کے علاوہ آزمانہ یا تجربہ کرنا بھی انشائیہ کے ضمن میں آتا ہے۔

اس کے برخلاف انگریزی میں ایسے (Essay) کے معنوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ 'کاہش'، 'کاوش'، 'تگ ودو'، 'سعی'، 'جہد'، 'جانفشانی'، 'محنت'، کوئی کام انجام دینے کے لئے کی گئی کوشش' آزمائش' امتحان یا تجربہ۔ مختصر ادب پارہ جس کا مقصد کسی خاص نکتہ کا اثبات یا موضوع

کی توضیح وتعبیر ہو‌‌‌۔ اس کے لئے مزید متبادل الفاظ بھی دیے گئے ہیں اور وہ ہیں تھیم آرٹیکل پیپر‘ مسودہ‘ تھیسس‘ ڈسرٹیشن‘ ڈسکورس‘ ورک آف آرٹ give it a whirl, or give it a shot, do one's best.

انشائیہ اور ایسے (بہ معنی مضمون) کے فرق کے موضوع کا میں نے اس لئے انتخاب کیا کہ اردو ادب کے نثری اصناف کی جو فہرست ہے اس میں دو اصناف ’’رپورتاژ‘‘ اور ’’انشائیہ‘‘ ایسے ہیں جنہیں بیشتر نو مشق ادیبوں نے ٹھیک سے سمجھا نہیں ہے۔ کسی کانفرنس یا ادبی اجلاس کی رپورٹنگ کرتے ہوئے اسے ’’رپورتاژ‘‘ کا عنوان دے دیتے ہیں اور بالکل اسی طرح کسی مزاحیہ خاکے یا صحافتی مضمون کو انشائیہ کہتے ہوئے نہیں جھجکتے۔ اس کا مشاہدہ ہمیں آئے دن ان مضامین کو پڑھ کر ہوتا ہے جو اخباروں اور کبھی کبھی رسالوں میں چھپتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے انگریزی میں ایسے (Essay) کی اصطلاح مضمون اور انشائیہ دونوں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ میں یہاں انگریزی کے انشائیہ نگاروں کی فہرست دے کر آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ اور نہ ہی اردو کے ان مضامین کا ذکر کروں گا جو انشائیہ کی تعریف میں نہیں آتے ۔ یہ دونوں باتیں قارئین کو کئی کتابوں‘ رسالوں اور اخباروں میں مل جائیں گی۔ لہذا یہاں مختصراً تحریر کے ان نمونوں کو پیش کروں گا جو انشائیہ کی تعریف میں آتے ہیں۔

اس سے قبل دو ایک باتیں انشائیہ کی ابتداء کے بارے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ انشائیہ کا پہلا موجد سولہویں صدی کا ایک فرانسیسی ادیب Macheal De Montaign قرار دیا گیا ہے۔ اسی دور میں شہنشاہ اکبر کے ایک نورتن ابوالفضل کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس نے شہنشاہ کی طرف سے جو رقعات لکھے اور اپنی یادداشتوں کا ایک دفتر تیار کیا تو انہیں ’’انشائے ابوالفضل‘‘ کہا گیا۔ یہ فارسی میں تھے مون ٹین کی پیدائش ۱۵۵۳ء کی ہے اور ابوالفضل اُس سے دو سال بڑا تھا۔ اردو کے ادیبوں میں اولین انشاء پرداز کے بارے میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر آدم شیخ کے مطابق سرسید احمد‘ محمد حسین آزاد یا میر ناصر علی کو ابتدائی دور کے انشاء پردازوں میں شامل کیا جاتا

ہے۔ کسی نے نیاز فتح پوری کو پہلا انشاء پرداز ٹھہرایا ہے۔ کسی اور نے مہدی حسن کے نام کا قرعہ نکالا۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین نے نیرنگ خیال کو ابتدائی انشائیے قرار دیتے ہوئے ان میں بتدریج ہونے والی تبدیلیوں کا بڑی خوبصورتی سے ذکر کیا ہے۔ اور ’’صنف انشائیہ‘‘ کے مقدمے میں یہ بھی لکھا ہے کہ اردو میں انشائیہ کو صنفی لحاظ سے پہلے اختر اورینوی نے روشناس کروایا۔ (ص۱۰ انشائیہ پچیسی۔ جاوید وشٹ) اس طرح سرسید احمد اور مولانا محمد حسین آزاد سے لے کر آج تک انشائیہ نگاروں کی کوئی ڈیڑھ سو سال کی تاریخ بنتی ہے۔

آگے بڑھتے ہوئے اٹھارویں صدی کے ڈاکٹر سیموئل جانسن کا ذکر ناگزیر سمجھتا ہوں کہ اس کے بیشتر مضامین اور خطوط انشائیہ کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ارل آف بیوٹ کو لکھے ہوئے ایک خط کا اقتباس (ترجمہ) ملاحظہ ہو۔

’’مخدومی (My Lord)

قوی امید ہے کہ جن نوازشوں سے آپ نے میرے حق میں وظیفہ کی سفارش کی ہے وہ مجروح نہ ہوں گے اگر میں اس کے مستقل اجراء کی درخواست کروں..........

میرے آقا یہ مناسب نہیں کہ اپنی چھوٹی سی ضرورت کے لئے آپ کی مصروفیات میں مداخلت کروں لیکن آپ کی مردم شناس شخصیت سے یہ بات چھپی نہیں ہے کہ کسی بھی آدمی کی ضرورت کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو وہ اس کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ہر شخص اس آس میں لگا ہوتا ہے کہ اسے مایوس نہیں کیا جائے گا۔ اس کے گناہ بھی اس کی امیدوں میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ وہ عطیہ جو اسے اپنے سخی داتا سے حاصل ہوا ہے اس سے وہ محروم نہ ہوگا۔‘‘

سیموئل جانسن کے لارڈ چسٹر فیلڈ کو لکھے ہوئے خطوط بڑے ہی طنز آمیز ہیں لیکن انشائیہ سے بھرپور ہیں۔ اس دور کے ایک آرٹسٹ سر جوشوا رینالڈ کی مدح میں تحریر کیا ہوا ایک انتساب جو جیمس باسویل کی جانسن پر لکھی ہوئے سوانح کی زینت ہے اسے پڑھ کر سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ طوالت کے خوف سے میں اسے یہاں پیش نہیں کر رہا ہوں۔

اردو میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط میں جو انشائیہ کی عمدہ مثالیں ہیں اس پر دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ اردو کے سارے طالب علم اس سے واقف ہیں۔ ایک اقتباس پیش ہے۔

''......جن باتوں کو ہم زندگی کی راحتوں اور لذتوں سے تعبیر کرتے ہیں وہ ہمارے لیے راحتیں اور لذتیں ہی کب رہیں گی اگر ان تقاضوں اور لذتوں سے منہ موڑلیں؟ بلا شبہ یہاں زندگی کا بوجھ اٹھا کے کانٹوں کے فرش پر دوڑنا پڑا' لیکن اس لئے دوڑنا پڑا کہ دیبا و مخمل کے فرش پر چل کر ان تقاضوں کا جواب دیا نہیں جاسکتا۔ کانٹے کبھی دامن سے اُلجھیں گے۔ کبھی تلووں میں چبھیں گے لیکن مقصد کی خلش جو پہلوئے دل میں چبھتی رہے گی' نہ دامن تار تار کی خبر لینے دے گی' نہ زخمی تلووں کی......''

ایک اور اقتباس مولانا محمد حسین آزاد کے ایک خط سے ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنے نااہل شاگردوں سے پیچھا چھڑانا چاہا لکھا ہے۔

''......بعض دوستوں نے تعجبا پوچھا کہ یہ کیا بات ہے فرمایا کہ روز واہیات بکواس لکھتے ہیں اور آ کر میری چھاتی پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اس فرمائش کا اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ روز کے آنے والے چوتھے دن غزل لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس کام کو انسان کچھ خرچ کر کے سیکھتا ہے اس کی قدر بھی ہوتی ہے اور شوق بھی پکا ہو جاتا ہے اور جو کچھ لکھنا ہے جان کاہی سے لکھتا ہے۔ اس کا تو ادھر وہ فائدہ ہوا۔ میرا ادھر یہ فائدہ ہوا کہ آیا تو چیز آ گئی نہ آیا تو میرا پیچھا چھوٹا۔۔۔''

بعض قلم کار اپنے مزاحیہ مضامین میں انشائیہ کا طرز اسلوب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک مزاح نگار نے شاید کرشن چندر کی تحریر ''گدھے کی سرگزشت'' کی نقل کرنی چاہی لیکن انشائیہ تو کہیں غائب ہوگیا۔ پھکو بازی کا نمونہ رہ گیا۔ ملاحظہ ہو۔

''آدمی اور گدھے میں فرق یہ ہے کہ گدھا صرف گدھا ہوتا ہے جب کہ آدمی ''اشرف الگدھا'' ہوتا ہے۔ کسی کو یہ اصطلاح ثقیل معلوم ہو تو آسان اردو میں ''سوپر گدھا'' کہا جاسکتا ہے۔ آدمی کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ جب چاہے گدھا بن سکتا ہے جب کہ گدھا کسی بھی حالت میں آدمی نہیں بن سکتا''

اگلا پیراگراف اس سے بھی زیادہ مایوس کن ہے حذف کیا جاتا ہے۔

ملا وجہی کی ''سب رس'' کو انشائیہ کہا جاتا ہے۔ اختلاف کی گنجائش کم ہے لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہم کسی افسانے یا ناول کو انشائیہ کا نام نہیں دیں گے۔ اس میں انشائیوں کی کثرت ہوسکتی ہے۔ کسی دوسرے موضوعات پر لکھی ہوئی تحریروں میں بھی بہ کثرت انشائیہ کا اسلوب پایا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ خواجہ حسن ثانی نظامی کی تالیف ''صوفی سلسلے'' میں موجود ہے۔ اسی طرح رالف رسل کی خودنوشت سوانح کا ترجمہ (ارجمند آرا) کراچی کے ''آج'' کے ۴۰ ویں شمارہ میں چھپا ہے۔ اس سوانح کا ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''میں گندے پانی کے پاس بیٹھا مینڈکوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ کل رات جب ہم کھانا کھانے بیٹھے تو انہوں نے آسمان سر پر اٹھالیا اور صبح تک راگ الاپنا بند نہ کیا۔ گاڈ مدر کا بھی کہنا ہے کہ مینڈکوں کی چیخوں نے اس کی نیند کو ڈرا کے بھگا دیا۔ اور اب وہ آرام کرنا چاہتی ہے اس لئے اس نے حکم دیا کہ میں یہاں ہاتھ میں لکڑی کا تختہ پکڑ کر بیٹھا رہوں اور ان مینڈکوں کا بھرتا بناتا جاؤں تاکہ وہ پھر یہاں پھدکنے کی جراءت نہ کریں''

ہمارے ادیبوں میں خواجہ حسن نظامی' مرزا فرحت اللہ بیگ' پطرس بخاری' فرقت کاکوروی' محمد حسن اور چند دیگر فن کار انشاپردازی کے ماہر مانے جاتے ہیں۔ ان کے پاس تخیل کی فراوانی بھی ہے اور زبان و بیان کا اسلوب بھی۔ لیکن سید آوارہ جیسے انشائیہ نگار بھول جاتے ہیں کہ صرف زبان اور محاوروں کا استعمال تحریر کو اچھا انشائیہ نہیں بنا سکتے۔ وہ کوئی مضمون ہوسکتا ہے۔ ان کے دو مضامین ''بیتی بات'' اور ''مونچھیں'' پڑھنے کا موقع ملا تو اس میں زبان اور محاورہ کا استعمال تو خوب ہے لیکن قاری کی حیثیت سے میں مطالعہ کا حظ نہ اٹھا سکا۔

افسانہ نگار جوگیندر پال کی شہرت انشائیہ نگاری کی تو نہیں لیکن چند سچے واقعات کو انہوں نے اپنے انشائیہ ''اے ہوش مندو'' میں کمال خوبی سے بیان کیا ہے اقتباس ملاحظہ ہو۔

''آج انسان کو اپنے ایک ہی دشمن سے سارے خطرات لاحق ہیں اس کا تدبر جسے کام میں لاکر وہ کیا پتہ کب چشم زدن میں قیامت برپا کردے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دنیا کی دو سب سے ہوش مند قومیں ایک دوسرے کے خوف سے پاگل ہیں اور ان کے کسی صلح جو مہم کے دوران جب گلے ملتے ہیں تو بہ یک وقت اپنی اپنی پیٹھ میں خنجر کی چبھن محسوس کر رہے ہوتے ہیں حالانکہ وہ ایسے ایسے سائنسی کرتب کر جاتے ہیں کہ اپنی بڑی میٹھی مسکراہٹوں کے راستے اپنا سارا زہر ایک دوسرے کے بدن میں اُتارتے چلے جاتے ہیں۔ دونوں قوموں کا دعویٰ ہے کہ جب تک ہمہ وقت جنگ کے لئے تیار رہیں گے ان کے درمیان امن بنا رہے گا۔ اپنے اس دعویٰ کے جواز میں دونوں کے پاس اتنے مہلک ہتھیار ہیں کہ ایک ذرا بٹن دبا کر دو جہاں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں۔ ہر دو نے اپنی حفاظت کے لیے ایسے غار بنا رکھے ہیں کہ نیوکلیائی پرزوں کے حرکت میں آجانے سے جب سانپ اور بچھو تڑپتے ہوئے اپنے بلوں سے باہر آجائیں تو یہ ان کے مانند زمین دوز زندگی اختیار کرلیں اور جنگ کے سایہ چھٹ جانے کے بعد مزے سے رینگ رینگ کر جئیں۔'' (یہ انشائیہ سوویٹ یونین کے بکھرنے سے قبل لکھا گیا)

سرسید احمد (وفات ۱۸۷۸ء) کو رحلت کیے کوئی ۱۳۰ سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس عرصے میں انشائیہ کے اسلوب اور طرز بیان میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اُسے انگریزی کی اصطلاح میں ہم Sea Change کہہ سکتے ہیں۔ طرز نگارش کے علاوہ عنوانات بھی چونکا دینے والے ہیں جیسے ''ریا کار تولیہ'' ''عشک وشک''۔

یہی وجہ ہے کہ انشائیہ کی مختصر تعریف ممکن نہیں ہے۔ ایک انشائیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف موضوع کی توضیح تعبیر کرے بلکہ ایک خاص رو میں لکھا جائے۔ مصنف کے لئے ضروری

ہے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ تحریر میں رمزیت اور تہہ داری کے ساتھ ایجاز و اختصار بھی ہو اور بے ساختگی بھی۔ ایک انشائیہ آپ بیتی بھی ہوسکتا ہے اور جگ بیتی بھی۔ لیکن ایجاز و اختصار کا مطلب یہ نہیں کہ وہ منی افسانے کی طرح ہو۔ ''امید'' یا ''گلشن بہار'' یا ''آگ'' (سرسید احمد، ماسٹر راجندر، محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ) جیسی تحریروں کو آج ہم انشائیے قرار نہیں دے سکتے۔ اس کے برخلاف ایسا (Essay) اینے جسے ہم مضمون کہتے ہیں وہ معلومات پہنچا سکتا ہے۔ واقعات کی اطلاع دیتا ہے۔ کسی خطہ کا جغرافیہ بیان کرتا ہے۔ راستہ کی ہمواری یا ناہمواری کی بات کرسکتا ہے۔ موسم کے خوشگوار یا ناخوشگوار ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ تاریخ بیان کرسکتا ہے۔ حالات حاضرہ پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ مارکٹ اور اشیاء کی قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ پیش کرتا ہے۔ کرداروں کے رویّوں پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ وہ کسی اخبار کا اداریہ ہوسکتا ہے۔ کوئی صحافتی مضمون، کوئی صدارتی خطبہ، کسی کو لکھا مکتوب۔ کسی عنوان پر ایک مضمون یا بیان پڑھ کر اُسی عنوان پر کوئی دوسری تحریر پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن انشائیہ کا معاملہ مختلف ہے۔ اوپر بیان کیے ہوئے سارے مضامین سارے عنوانات انشائیے بن سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ یہ بوقلمونی کے مظہر ہوتے ہیں۔ ان پر مصنف کی فطانت وذہانت کی، علم کی اور قلم کی چھاپ ہوتی ہے۔ لہجہ خطیبانہ نہیں شاعرانہ ہوتا ہے۔ ان میں تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور تلازمے استعمال ہوتے ہیں۔ اشاروں کنایوں میں بات ہوتی ہے۔ یہ جھوٹ سے عاری ہوتے ہیں۔ مضامین اور خاکوں کی مبالغہ آمیزی جھوٹ کی سرحدوں کو پار کرجاتی ہے۔ جو انشائیہ کا عیب ہے۔ انشائیہ مصنف کے نفس کو کیف اور روح کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔ اور قاری کو شادابی اور مسرت۔ مضمون اور انشائیہ کے درمیان خط فاصل یہ ہے کہ مضمون کسی کی فرمائش یا مالی منفعت کے لئے لکھا جاسکتا ہے۔ اور انشائیہ مصنف کے قوت متخیلہ کی دین ہے۔

انشائیہ کے بارے میں بیشتر محققین نے یہ بات کہی ہے کہ اردو میں یہ صنف فرانسسی اور انگریزی زبانوں سے ہوکر آئی ہے۔ یہ بات سچ ہے تو پھر ابوالفضل کے اُن چار دفتروں کے

بارے میں جو سولہویں صدی میں لکھے گیے کیا رائے دی جاسکتی ہے۔ لسانیات کے اصول کے مطابق کسی زبان کو اپنی کھڑکیاں کھلی رکھنی چاہیئے لیکن جن ادبی اصناف کی بالیدگی اُس زبان میں ہوتی ہے وہ اُس کے اپنے معاشرہ کی دین ہے۔ اُس کا اپنا دروازہ ہوتا ہے۔ ردّو قبول کے زبان کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ ملّا وجہی نے جو انشائیے مختلف موضوعات پر تحریر کئے ہیں اُن کے بارے میں بعض محققوں کی رائے ہے کہ اُن میں تہہ داری ہے۔ وجہی نہ تو فرانسیسی نہ انگریزی سے واقف تھے اور نہ اُنہوں نے انشائیوں کے ترجموں کو فارسی یا دکھنی زبان میں پڑھا ہوگا۔

ایک اہم سوال خاکوں اور انشائیوں کے بنیادی اختلاف کا ہے وہ ہے مبالغہ آمیزی اور احتمال کا۔ وزیر آغا نے ۱۲ خصوصیات انشائیوں سے متعلق بیان کی ہیں اُن سے بہت کم اختلاف کی گنجائش ہے لیکن انشائیہ اور مضمون کے بارے میں جس بنیادی اختلاف کا ذکر میں نے کیا ہے اُس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ ایک مثال پیش ہے:

اگر کسی محفل میں کوئی خاتون پان چبا رہی ہو اور یہ باور کیا جائے کہ وہ پان ایسے چبا رہی تھی لگتا تھا جیسے محفل کے سارے لوگ پان چبا رہے ہوں تو اس بیان میں مبالغہ آمیزی ہونے کے باوجود احتمال کی گنجائش ہے کہ یہ بات صحیح بھی ہوسکتی ہے۔ برخلاف اگر کسی خاتون کے سامنے ایک طشتری بھر پان کے بیڑے پیش کیے جائیں اور دس منٹ بعد بیڑے پیش کرنے والا یہ کہے اس خاتون نے سارے بیڑے چبا ڈالے ہیں تو اس مبالغے میں جھوٹ شامل ہوگیا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی خاتون دس منٹ میں طشتری بھر پان کے بیڑے چبا ڈالے۔ جھوٹ کی حد تک مبالغہ آمیزی کسی خاکے کا جز بن سکتی ہے۔ لیکن کسی انشائیہ کا ہرگز نہیں اس لئے کہ انشائیہ اعلیٰ و ارفع صفِ سخن ہے۔ وہ نفس کو فرحت اور روح کو بالیدگی عطا کرنے والی صفات کا حامل ہوتا ہے اور مبالغہ آمیزی ان لطیف احساسات کو مجروح کر دیتی ہے۔ دیگر لوازمات کے ساتھ یہی کسی مضمون، اور انشائیہ کا امتیاز ہے۔

•❖•

سوئے انشائیہ

(بہ سلسلہ انشائیہ اور مضمون کے امتیازات)

اردو میں اکیسویں صدی غالباً انشائیہ کی صدی ہوگی۔ ویسے اس موضوع پر گفتگو کا آغاز بیسویں صدی کی ابتداء ہی سے ہوتا ہے۔ اس صدی کے پانچویں دہے سے اس پر زیادہ بحثیں ہوتی رہیں اور یہ آج تک جاری ہیں۔ ۲۰۰۰ء کے اختتام پر ایسا لگتا ہے کہ بہت سے نثر نگاروں نے اس پر خاص توجہ دینی شروع کردی۔ چناں چہ ادھر مختلف رسالوں میں انشائیہ کے عنوان سے مضامین چھپ رہے ہیں۔ بعض رسالوں نے انشائیہ نمبر بھی نکالے۔ ممکن ہے ہم ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین میں جو انشائیہ کے علاوہ ہیں ایسے عناصر تلاش کرسکیں جن کی عبادت انشائیہ جیسی لگتی ہے۔ ساتھ ہی ان مضامین کا جائزہ بھی لیں جو انشائیہ کے عنوان سے چھپے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون عناصر ہیں جن سے ایک مضمون انشائیہ کہلایا جاسکتا ہے۔ اس پر آگے چل کر بحث ہوگی۔

ہمارا موضوع چوں کہ ''سوئے انشائیہ'' ہے اسی لئے اس سے متعلق موضوعات پر ہی ہم زیادہ توجہ دیں گے جو یا تو خالص انشائیہ نگاری کے زمرہ میں آتے ہیں یا جن میں انشائیہ نگاری کے عوامل شامل ہیں۔ ان میں زیادہ اہم ہیں کالم نگاری، خاکہ نگاری اور رپورتاژ، خطبات، مکتوبات، روزنامچے اور سفرناموں میں بھی انشائیہ نگاری کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ کہیں کثرت سے اور کہیں خال خال۔ تاہم یہاں ہم کالم نگاری اور رپورتاژ کے بارے میں سرسری اظہار خیال کرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے تاکہ خاکہ نگاری اور انشائیہ نگاری پر سیر حاصل بحث ہوسکے۔ ان

دونوں کا موازنہ اس لئے ضروری ہے کہ جس طرح خاکہ نگاری کو دو وسیع تر عنوانات کے تحت بانٹا جاسکتا ہے، اسی طرح انشائیہ نگاری پر بھی دو وسیع تر عنوانات کے تحت بحث ہوسکتی ہے۔ خاکے یا تو شخصیات پر لکھے جاتے ہیں یا موضوعات پر۔ شخصیات پر لکھے گئے خاکے سوانحی خاکے کہلائے جائیں گے اور دوسرے موضوعاتی۔ اسی طرح شخصیات پر لکھے گئے انشائیوں کو ہم سوانحی انشائیہ کہیں گے اور دوسرے موضوعاتی انشائیہ کہلائیں گے۔ پہلے ہم رپورتاژ سے شروع کرتے ہیں۔

رپورتاژ: رپورتاژ اس واقعہ کی رپورٹ یا روئیداد ہے جس کے بارے میں مصنف نے قلم اٹھایا ہے جیسے مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون جو انہوں نے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس کے بارے میں لکھا ہے۔ اسے انہوں نے خاکے کا عنوان دیا ہے لیکن اس میں رپورتاژ کے پورے عناصر ہیں۔ کرشن چندر کا ''پودے'' رپورتاژ کی عمدہ مثال ہے۔ رپورتاژ کے لئے لازمی ہے کہ مصنف ان ابتدائی واقعات کا بھی ذکر کرے جو آگے چل کر اُن واقعات کا پیش خیمہ ثابت ہوں اور جن کا پروگرام کی روئیداد سے تعلق ہو۔ رپورتاژ ایک دوسری عمدہ مثال مہاراشٹرا سے شائع کیے گئے ''اثبات'' سہ ماہی کے نقشِ ثانی ستمبر تا نومبر ۲۰۰۸ء میں ملے گی۔ اس رپورتاژ کو ''کچھ منظر کچھ پس منظر'' کے عنوان سے شہاب الٰہ آبادی نے تحریر کیا ہے۔ ایک عرصہ بعد اتنا اچھا رپورتاژ میرے مطالعے میں آیا۔

رپورتاژ میں نہ صرف یہ کہ مصنف اپنے داخلی تاثرات بیان کرتا ہے بلکہ ماحول اور اطراف میں ہونے والے ان واقعات کی عکاسی بھی کرتا ہے جو نفسِ مضمون سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے راستہ سے گذرتا ہوا کوئی شخص صرف راستے کی ہمواری یا ناہمواری اور نشیب و فراز ہی کا ذکر نہیں بلکہ راستے کے اطراف واکناف کا بھی ذکر کرے۔ کسی بھی کانفرنس، کنونشن، یا میٹنگ یہاں تک کہ شادی بیاہ کے واقعات پر بھی رپورتاژ رقم کیا جاسکتا ہے۔ شادی بیاہ کے واقعات چوں کہ ایک مخصوص خاندان سے متعلق ہوتے ہیں اس لئے ان پر قلم اٹھانا اسی وقت

مناسب ہے جب اس میں آفاقیت کی گنجائش ہو، تاکہ کوئی بھی قاری اُس میں دلچسپی لے سکے۔ زبان کی سلاست اور شگفتگی محاورات اور ضرب الامثال کے استعمال اور تخیل کی کارفرمائی کے عوامل اُس طرح ہوں جس طرح دوسرے اصنافِ سخن میں استعمال ہوتے ہیں۔ مزید ایک رپورتاژ کہانی یا قصہ کی طرح ہو تو قاری کی دلچسپی میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ اس میں بیرونی مداخلت کاروں اور اُن کی کارستانیوں کی ہی نہیں بلکہ ان کی صفات اور نفسیاتی کیفیتوں کی بھی ملاوٹ ضروری ہے۔ ساتھ میں مصنف کے ذاتی تاثرات بھی شامل ہوں۔

کالم نگاری: روزمرہ کے سیاسی اور سماجی واقعات کو ایک کالم نگار اپنی تحریر کا موضوع بناتا ہے تو اُس میں طنز و مزاح کا پہلو بھی بقدرِ ضرورت شامل کردیتا ہے۔ کس بے باکی سے اُن موضوعات کو وہ عوام کے سامنے پیش کرتا ہے اس کا دارومدار اُس کی جسارت پر ہے تو اُن کے معیار کا انحصار اس کی قابلیت پر ہے۔ مجھے پاکستان کے کالم نگار عطاء الحق قاسمی کے چند کالم پڑھنے کا موقع ملا۔ ان میں صرف طنز و مزاح ہی نہیں بلکہ زبان و بیان کا چٹخارہ بھی ہے۔ طنز بھی اس طرح کا کہ کوئی شخص مجروح ہوجائے تو وہ ثابت نہیں کرسکتا کہ یہ طنز اسی پر کیا گیا ہے۔ پڑھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ اس کا ہدف کون ہے۔ مقصد تخریبی نہیں بلکہ تعمیری ہوتا ہے۔

پاکستان کے ایک اور کالم نگار طاہر مسعود ہیں۔ انہوں نے اپنے کالموں کا ایک مجموعہ ''برگردنِ راوی'' کے عنوان سے ۱۹۸۸ء میں لاہور سے چھپوایا۔ جملہ ۵۶ کالم اس میں شامل ہیں۔ اپنے پر جبر کرتے ہوئے میں نے اس کتاب کے دس کالم پڑھے۔ دس کالم پڑھنے کا سبب مشفق خواجہ کی وہ تحریر ہے جو کتاب کے فلیپ پر چھپی ہے۔ اس کا آخری جملہ ہے ''طاہر مسعود کے ہاں لفظوں کے استعمال میں وہ مہارت نظر آتی ہے جو صحافت کو ادب بنادیتی ہے۔ مزید یہ کہ موضوع کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو طنز کا وار کتنا ہی کاری کیوں نہ ہو طاہر مسعود کے بیان کی شگفتگی اس شخص کو بھی بے مزہ ہونے نہیں دیتی جو طنز کا ہدف بنتا ہے''۔

اس کتاب کے آخری مضمون کا عنوان ہے ''کالم اور کالم نویسی'' کالم نگاری کی صحافتی زبان اور اس کا اسلوب کہاں تک ادب کا حصہ بن سکتے ہیں اس ایک اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لکھتے ہیں'' کالم نگار کا اپنا ذہنی موسم ہوتا ہے۔ خوشگوار اور تروتازہ موڈ میں وہ بے تحاشہ باتیں لکھتا ہے اور لکھتا چلا جاتا ہے لیکن کبھی یوں بھی ہوتا ہے اس کا دل و دماغ یکا یک بنجر زمین میں تبدیل ہوجاتا ہے اور اس کی اپنی کیفیت ایک مایوس کسان یا بانجھ عورت جیسی ہوجاتا ہے...... میرے خدا اس کا تصور ہی کتنا ہولناک ہے''۔ موصوف کا یہ اظہار خیال اُن کی کالم نویسی کے فن میں ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ کلیدی اظہار کا یہ عالم ہے تو باقی تحریروں کے بارے میں قاری اپنے سے اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ کس معیار کے ہوں گے۔ ادھر کچھ عرصہ قبل مشفق خواجہ (رحلت سے قبل) کے بارے میں ایک پاکستانی ادیب نے خیال ظاہر کیا کہ مشفق خواجہ بھی دوستوں اور دشمنوں سے بے نیاز نہیں ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کو نوازتے ہیں اور دشمنوں کی خبر لیتے ہیں۔

حیدرآباد کے روزنامہ سیاست میں بعض بہت ہی دلچسپ اور کارآمد کالم چھپے ہیں۔ شاہد صدیقی کے دوران حیات اردو کا اخبار پڑھنے والا کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس نے شاہد صدیقی کے کالم ''شیشہ و تیشہ'' نہ پڑھے ہوں۔ ان کی رحلت کے بعد یہ کام مجتبیٰ حسین کے ذمہ کیا گیا۔ کوئی پچاس سال سے زائد عرصہ سے وہ ہر ہفتہ ایک کالم لکھتے ہیں۔ طبع زاد لکھتے ہوئے تخلیق کار کسی بھی صنف میں معیار قائم رکھ سکتا ہے لیکن جب فرمائش پر یا اُجرت حاصل کرنے کے لئے کوئی مسلسل لکھتا رہے تو چند مضامین ہی بلند پایہ ہوسکتے ہیں۔ چوں کہ کالم نگاری میں خاکہ نگاری اور انشائیہ نگاری کے نقوش بھی پائے جاتے ہیں اور مجتبیٰ حسین کو بجائے روز روز کے ہفتہ میں ایک کالم لکھنا پڑتا ہے تو اُن کے بعض کالموں میں طنز و مزاح کی خوشگوار کیفیتوں کے ساتھ انشائیہ نگاری کی امتیازی اور دلپذیر تحریریں بھی در آئی ہیں۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

خاکہ نگاری: یہ فن کالم نگاری کے مقابلہ میں ذرا مشکل فن ہے۔ طنز ہو یا نہ ہو اس میں مزاح کا

ہونا ضروری ہے۔ انشائیہ کی طرح خاکے بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ سوانحی خاکے یا موضوعاتی۔ اردو ادب کا مطالعہ کرنے والا کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس نے پطرس بخاری کو نہ پڑھا ہو۔ ''کتے'' اور ''سیکل'' پر لکھے ہوئے خاکے موضوعاتی ہیں جب سوانحی خاکوں کی بات آتی ہے تو عصمت چغتائی کا عظیم بیگ چغتائی پر لکھا ہوا خاکہ ''دوزخی'' اور اپندرناتھ اشک کا سعادت حسن منٹو پر لکھا ہوا خاکہ کبھی نہ بھولنے والے فن پارے ہیں۔ خود منٹو نے دلچسپ خاکے لکھے ہیں جیسے محمد علی جناح پر ''میرا صاحب'' ہے۔ اردو کے بیشتر قارئین کے لئے جو خاکہ خاصہ کی چیز ہے وہ ہے مرزا فرحت اللہ بیگ کا ڈپٹی نذیر احمد پر لکھا ہوا خاکہ۔ اس کا عنوان ہے ''ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی۔ کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی''۔ خاکہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے ''اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا......'' اور اڑتالیس صفحات کے بعد یہ خاکہ ذوق کے اس شعر پر ختم ہوتا ہے

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور سارے جانور — اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اس میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ اُردو زبان کی تاریخ کا حصہ ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ نئی نسل کے لوگ چاہے وہ اردو داں ہی کیوں نہ ہوں اس دور کی زبان سے مانوس نہ ہونے کے سبب اس خاکہ کو دلچسپی سے پڑھ نہ پائیں گے۔ ڈپٹی نذیر احمد ان دنوں دلی میں بسنے والے ان تین اشخاص میں سے ایک تھے جو عربی داں تھے۔ چناں چہ اس مضمون میں عمرو بن کلثوم کے قصیدہ کا ایک شعر تین جگہ دہرایا گیا ہے۔ شعر ہے۔

ربا هند فلاتعجل علینا — وانظرنا تجزک الیقینا

یہ شعر ڈپٹی صاحب کبھی لہک لہک کر پڑھتے اور کبھی ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں۔

اس دور کا ماحول، واقعات و حالات بھی مختلف ہیں۔ اقتباسات دینے سے احتراز کرتا ہوں کہ مضمون طویل ہوجائے گا۔ ان ہی کا وحید الدین سلیم پر لکھا ہوا خاکہ بہت عمدہ ہے لیکن عام نہیں ہوا۔ کسی خاکے میں خدوخال یا پہلی ملاقات کا ذکر یوں تو ضروری نہیں ہے لیکن اس کے بیان

سے خاکے میں ندرت پیدا ہوسکتی ہے۔ اس خاکے سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں، عنوان ہے ''ایک وصیت کی تعمیل''۔ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ وفیات پر لکھا ہوا یا قانون سے متعلق کوئی مضمون ہوگا لیکن اس کا پہلا ہی پیراگراف اس کی نفی کرتا ہے۔''خدا بخشے وحیدالدین سلیم بھی ایک عجیب چیز تھے۔ ایک نگینہ سمجھئے کہ برسوں ناتراشیدہ رہا۔ جب تراشا گیا پھل نکلے......''

پہلی ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔''......کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے بڑے بڑے ڈگ بھرتے میری طرف چلے آرہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گھٹیلا بدن، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت، اس پر سفید چھوٹی سی گول داڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پاجامہ، کتھئی رنگ کی کشمیر کی شیروانی، سر پر عنابی ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا۔ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگالیا۔ مولوی صاحب نے ڈپٹی نذیر احمد کے مضمون کی تعریف کی اور کہا''میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ بھئی مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا۔ مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کردیا......''میری زبان کب رکتی، میں نے کہا مولوی صاحب آپ گھبراتے کیوں ہیں،، بسم اللہ کیجئے اور مرجایئے۔ مضمون میں لکھ دوں گا۔

آگے چل کر مولوی صاحب کی کنجوسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''جب ان کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کرلی ہے تو اب لکھتے کیوں ڈروں، واقعی بڑے ہی کنجوس تھے۔ ہزاروں روپے کے گریڈ میں تھے۔ دارالترجمہ سے بہت کچھ مل جاتا تھا، اگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ زیادہ ہی ہوگا...... خود چل بسے جمع پونجی دوسرے کے لئے چھوڑ گئے اور چھوڑ بھی اتنا گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہے کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے۔''

مولوی صاحب کی آواز اور پڑھنے کے لہجہ پر توصیفی کلمات ملاحظہ ہوں۔

''ان کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا جتنا بولنے میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ تقریباً دو ہزار آدمیوں کا مجمع تھا مگر سنانے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ لفظوں کی نشست، زبان کی روانی اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے، یا ایک برقی رو ہے کہ کانوں سے گذر کر دل و دماغ پر اثر کررہی ہے۔''

ایک آخری اقتباس پیش ہے۔ اس کا تعلق مولوی صاحب کی کنجوسی اور ان کی غذا سے ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے کہا آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا بھی ہے تو مولوی صاحب نے جواب دیا تھا کہ مدتوں ہوئی کھانا چھوڑ دیا ہے۔ صرف چائے پر گذران ہے۔ اس کے بعد فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں۔

''میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے اور کھاتے تو کیوں کر کھاتے۔ پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ماما رکھنی پڑتی، سامان منگوانا ہوتا، لکڑی کا خرچ تیل کا خرچ، غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے۔ چائے بنالی پی لی، ادھر اُدھر گئے پیٹ بھر لیا، گھر آئے بان کی کھری چارپائی پر لوٹ ماری، چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا......'' کوئی عبارت ایسی نہیں ہے جس پر سے سرسری گذر جائیں۔

اس مضمون میں خاکے کا مانوس اسلوب ہے۔ زبان و بیان کی سلاست و بلاغت ہے۔ مبالغہ بھی قابل قبول۔ احتمال کی گنجائش، طنز و مزاح کی چاشنی وہ بھی دل و دماغ کو فرحت بخشنے والی۔ اس سے بہتر خاکے بھی قاری کے مطالعہ میں آئے ہوں گے لیکن میں نے اسے اس لئے منتخب کیا ہے کہ ایسی تحریریں ہمارے کلاسیکل ادب میں جگہ پاچکی ہیں۔ دس صفحات پر پھیلے ہوئے اس خاکے کو پڑھئے کہیں کلفت محسوس نہ ہوگی۔ اس کا ذکر میں نے ذرا تفصیل سے اس لئے بھی کیا کہ آج کے بعض نو مشق ادیب ایک سیدھا سادھا صحافتی مضمون لکھ دیتے ہیں اور اُسے خاکے کا عنوان دیتے ہیں۔ ان اقتباسات کے مطالعہ پر اکتفانہ کرتے ہوئے اگر وہ چند معروف و مستند خاکے پڑھ لیں تو

پھر ان کی تحریروں میں نکھار آسکتا ہے۔ میرا ایک اور بھی مقصد ہے کہ میں ان اقتباسات کا موازنہ چند انشائیوں سے کرنا چاہتا ہوں تا کہ خاکہ اور انشائیہ کا فرق کھل کر ہمارے سامنے آئے اور ہمیں محسوس ہو کہ ہم کہاں غلطی کررہے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں انشائیہ کا باب کھولوں ایک اقتباس مشتاق احمد یوسفی کی تحریر سے دینا چاہتا ہوں۔ فیصلہ قاری پر چھوڑتا ہوں کہ یہ تحریر فکاہیہ ہے۔ مزاحیہ ہے یا انشائیہ یا کیا ہے؟ یوسفی لکھتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی: ''ایک فرانسیسی مفکر کہتا ہے کہ موسیقی میں جو بات مجھے پسند ہے دراصل وہ حسین خواتین ہیں جو اپنی ننھی ننھی ہتھیلیوں پر ٹھوڑیاں رکھ کر سنتی ہیں۔ یہ قول میں نے اپنی بریت میں اس لئے نقل نہیں کیا کہ میں جو قوالی سے بیزار ہوں تو اس کی اصل وجہ وہ بزرگ نہیں جو محفل سماع کو رونق بخشتے ہیں اور نہ میرا یہ دعویٰ کہ میں نے پیانو اور پلنگ کے درمیان کوئی ثقافتی رشتہ دریافت کرلیا ہے''۔

اس بیان میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی۔ طنز کسی ایک پر نہیں ہے اور مزاح سب کے لئے ہے۔ ہمارے بچپن میں پلنگ کی چولوں سے جو آوازیں نکلتی تھیں وہ اب باقی نہیں رہیں۔ پلنگ دوسری طرح کے ہوتے ہیں اور بان یا نواڑ کے پلنگ ہیں بھی تو ان پر ایسے موٹے موٹے گدے بچھے ہوتے ہیں کہ آدمی کا وزن ہو کہ اس کی حرکتیں ان گدوں کی وجہ پلنگ کی آواز چولوں تک نہیں پہنچتی اور چولوں کی آواز بھی ان لوگوں تک نہیں آتی جو پلنگ استعمال کرتے ہیں۔ یوسفی نے جو بلیغ اشارہ پیانو اور پلنگ کا دیا ہے تو وہ پیانو کی اس موسیقی کا ہے جسے ننھی ننھی ہتھیلیوں والی خواتین ٹھوڑیوں پر ہاتھ رکھ کر سنتی ہیں۔ فرانسیسی مفکر کو پیانو کی موسیقی نہیں بلکہ وہ خواتین پسند ہیں۔ یوسفی قوالی سے بیزار ہیں اور ان بزرگوں سے بھی جو محفل سماع کو رونق بخشتے ہیں لیکن ''چارپائی اور کلچر'' کے زیرعنوان قلم بند کئے ہوئے مضمون میں جب وہ اپنے اس دعویٰ سے دستبردار ہوجاتے ہیں جو

پیانو اور پلنگ کی موسیقی کے درمیان ثقافتی رشتے کو جوڑنے کا ہے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہیں چارپائی کی چوں چاں یقیناً پسند نہیں لیکن قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ان خواتین کا کیا ہوا ہوگا جنہوں نے پیانو کی موسیقی کو تو کبھی نہیں سنا لیکن انہیں چارپائی کی چوں چاں اچھی لگی۔ اس ہیر پھیر سے نکلتے ہوئے اب میں انشائیہ کے نفس مضمون پر آتا ہوں۔ ادیبوں اور نقادوں کا نام لئے بغیر پہلے اُن عناصر کا ذکر کروں جو کسی انشائیہ کے لئے لازم سمجھے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ ان کا ذکر ''انشائیہ اور مضمون کے امتیازات'' میں آچکا ہے۔ یہاں ذرا تفصیل سے بات ہوگی۔

انشائیہ کی ایجاد: اس سے قبل یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ آیا انشائیہ کا فن فرانسیسی اور انگریزی زبانوں سے اردو میں آیا ہے یا اردو زبان کے ماحول اور معاشرہ کے داخلی رجحانات کی دین ہے۔ پہلے کہی ہوئی بات یہاں ایک اور بار دہرادیتا ہوں کہ فرانسیسی ادیب مون ٹین کی پیدائش ۱۵۵۳ء کی ہے جب کہ اکبر کے نورتن ابوالفضل کی پیدائش ۱۵۵۱ء کی ہے۔ یہ ثابت کرنا تو مشکل ہے کہ انشائیہ کا موجد مون ٹین ہے یا ابوالفضل۔ نہ مون ٹین کی رسائی ابوالفضل تک تھی اور نہ ہی ابوالفضل کی رسائی مون ٹین تک۔ اردو انسائیکلو پیڈیا فیروز اینڈ سنس (۱۹۸۴ء تیسرا ایڈیشن) کے مطابق ابوالفضل کے لکھے ہوئے خطوط و مضامین چار دفاتر پر مشتمل ہیں۔ انہیں انشائے ابوالفضل کہا گیا ہے۔ پہلے دفتر میں ان مکاتیب و فرامین کو شامل کیا گیا ہے جو اکبر کی طرف سے مختلف فرمانرواؤں کو لکھے گئے۔ ان خطوط کا لہجہ آمرانہ ہونے کے بجائے ادیبانہ ہوسکتا ہے۔ اسی لئے انہیں انشائے کہا گیا۔ دفاتر دوم و چہارم بادشاہ کے ذاتی خطوط پر مشتمل ہیں۔ خود اکبر تو لکھا پڑھا نہ تھا۔ اس کے خیال اور بیان کو ابوالفضل نے تحریر کی شکل دی۔ تیسرے دفتر میں ابوالفضل نے اپنی یادداشتیں تحریر کی ہیں۔ انہیں اس نے اپنے ذاتی مطالعہ اور استفادہ کے لئے لکھا۔ اس دور کے واقعات و حالات اپنے ذاتی تاثرات کے ساتھ بیان کئے تو ان کا اسلوب عام مضامین کے اسلوب سے جدا ہی ہوگا۔ ابوالفضل نے فارسی زبان استعمال کی ہوگی۔ اس پر تحقیق کی جائے اور ان دفاتر کا

حوالہ اقتباسات کے ساتھ دیا جائے تو ایک صحیح تصویر ہمارے سامنے آسکے گی۔ کسی محقق نے لکھا کہ انشا کا لفظ عربی میں ء کی اضافت کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ فارسی میں اسے حذف کردیا گیا۔ اس کے معنی عبارت لکھنا اور بات پیدا کرنے کے ہیں۔

جب ہم اردو ادب میں انشائیہ کے وجود کو تلاش کرتے ہیں تو ہمارے کئی مشاہیر ادب نے ملاوجہی کی سب رس کو انشائیہ کا اولین نمونہ قرار دیا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔ اس لئے بھی کہ ملاوجہی کی فرانسیسی یا انگریزی تک پہنچ نہیں تھی۔ ''قطب مشتری'' اور'' سب رس'' بالترتیب ۱۶۳۰ء اور ۱۶۳۵ء میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر جاوید وشٹ نے جو انشائیہ پچیسی (۱۹۸۵ء) کے مصنف ہیں، اپنی کتاب کے دیباچہ میں وجہی کے انشائیوں کو ان کے متن کی کیفیات کے اعتبار سے مختلف عنوانات کے تحت درجہ بندی کی ہے۔ مذہب، تصوف، عشق، فطرت انسانی، فنون لطیفہ، سماجی خمریات اور شاہی پر انہوں نے جملہ اکسٹھ انشائیوں کی نشاندہی کی ہے۔ البتہ یہ نہیں معلوم کہ انہوں نے مذہب اور تصوف کو الگ کرتے ہوئے مذہب کے سات اور تصوف کے گیارہ انشائیہ کیوں بتائے۔ ان کے نزدیک کیا تصوف اسلام سے الگ ہے یا مذہب ہی نہیں؟

ابتدائی دور کا مفروضہ: اگر ملاوجہی کے سب رس میں انشائیہ کے عناصر تلاش کرلئے گئے ہیں تو اردو انشائیہ کا آغاز سترھویں صدی کی چوتھی دہائی سے ہوتا ہے۔ ادیبوں اور نقادوں کی اکثریت نے سب رس کے مضامین میں انشائیہ کے وجود کی نفی کی تو بعد کے دور کے چند ادیبوں نے سرسید احمد خان اور ان کے ہم عصروں کی تحریروں کو کمزور انشائیے قرار دیا۔ اس بنیاد پر کہ وہ بہت ہی مختصر مضامین تھے۔ تاہم ابتدائی اور بعد کے دور کے جن انشائیہ نگاروں کا نام لیا گیا اُن میں رجب علی سرورؔ، محمد حسین آزادؔ، میر ناصرؔ علی، مہدی افادیؔ، محمد ذکاء اللہ، الطاف حسین حالیؔ، شبلیؔ نعمانی، سلیمان ندویؔ اور ان کے بعد عبدالحلیم شررؔ، خواجہ حسن نظامیؔ، احتشام حسینؔ، ابوالکلام آزادؔ، رشید احمد صدیقیؔ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ بعض تحریروں کو انشائیوں میں شمار کیا گیا لیکن جب دریافت ہوا کہ ان میں

قوم کی اصلاح کے عناصر کثرت سے موجود ہیں تو انہیں انشائیوں سے خارج کردیا گیا۔ بعض عجیب بحثیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں۔ میں نے بہت سے نام اس لئے چھوڑ دئے کہ ایک تو میں نے ان سب کو پڑھا نہیں ہے، دوسرے یہ کہ تحقیق کرنا اور ثبوت فراہم کرنا میرا کوئی مقصد بھی نہیں۔ چند نامور ادیبوں جیسے وزیر آغا، وحید قریشی، سید محمد حسنین، انور سدید یا سلیم اختر اتفاق رائے پر نہ پہنچ سکے تو میں تو ابھی انشائیہ کی شناخت کے مسئلہ سے الجھا ہوا ہوں اور کوشش میں لگا ہوں کہ اس کی صحیح پہچان کرسکوں۔ اس جستجو میں قارئین کو شامل کرلیا ہے تو ''لاف و دانش غلط و نفع عبادت معلوم'' کی منزل سے آگے چل کر میں انہیں بھٹکانا نہیں چاہتا۔ چند اشارے ہیں جن کی بدولت موضوع کی آگہی ہوسکتی ہے۔ فیصلہ ان کا اپنا ہوگا جو نام ابھی اوپر آئے ہیں ان کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد اور فرحت اللہ بیگ کے نام بھی لئے جاسکتے تھے لیکن ان کا شمار تو خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انشائیہ نگاروں کی فہرست میں اس لئے نہیں آسکتا کہ ان کے مضامین میں طنز و مزاح کی بہتات ہے۔

ماہنامہ ''صبا'': یہاں ایک حوالہ ماہنامہ ''صبا'' (۱۹۶۶ء شمارہ ۶'۷) کا دیا جاتا ہے۔ محمد اسحٰق ایوبی (مالیگاؤں۔ مہاراشٹرا) کی تین تحریریں بہ عنوان ''کاغذ قلم اور دوات''، ''رشوت جان''، اور ''دوست اور دوستی'' کے عنوان سے چھپیں تو انہیں انشائیہ کہا گیا۔ تعارف میں ایک صاحب رشید الدین نے لکھا کہ اردو میں یہ ایک نئی صنف ہے۔ بعض لوگ اسے انگریزی Essay کا مترادف سمجھتے ہیں مگر یہ انگریزی سے مختلف ہے۔ اُردو انشائیہ بیک وقت طنزیہ' مزاحیہ اور شگفتہ مضامین کے زمرہ میں آتا ہے۔ میں نے ان مضامین کا مطالعہ کیا تو یہ مجھے انشائیے نہ لگے۔ پہلی بات تو یہ کہ ان میں شگفتگی نہیں ہے۔ خود رشید الدین نے لکھا کہ یہ کہیں کہیں بے حد بوجھل ہوگئے ہیں۔ اعتراض بجا ہی ہے۔ پہلے مضمون ''کاغذ'' کے بارے میں اسحٰق ایوبی نے لکھا کہ اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ بڑھیا' گھٹیا' موٹا' پتلا' مضبوط' نازک' چکنا' کھردرا' سفید' رنگین' اُجلا' میلا المختصر آدمی کو رنگ و روپ' قدر و قیمت کے لحاظ سے جتنے خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے اتنی ہی قسمیں کاغذ کی بھی ہیں۔ دوسرے مضمون

رشوت جان کی ایک تحریر ہے ’’کھول کیسہ کھا ہریسہ‘‘ چناں چہ ہماری ہیروئن رشوت جان انھیں دنوں کی معاشقہ کی یادگار ہے۔‘‘ مزید رشوت جان کے بیشتر رشتہ داروں اور چاہنے والوں کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ اسی طرح تیسرا مضمون ہے۔ اس میں دوستوں کی اقسام گنوائی گئی ہیں۔ مسٹر بور، مسٹر ڈھور، حضرت سیر وشکار، مسٹر زور، مسٹر شور، مسٹر گور، مسٹر چت چور، مسٹر بے ٹھور، مسٹر مفت خور، مسٹر پتنگ کی ڈور...... اس طرح کی تحریروں کو ہم انشائیے کیسے کہیں؟ مدیروں اور نقادوں کی مروتیں اور بعض مجبوریاں اس کا سبب ہوسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہوگی کہ اُردو انشائیہ ابھی تک کسی ایک سمت میں اپنا تشخص قائم نہ کرسکا۔

انشائیہ نے گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں جو ارتقائی منازل طے کیے ہیں اس کی رفتار کچھوے کی چال جیسی لگتی ہے۔ کبھی کبھی یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کچھوا راستہ بھٹک کر منزل سے دور ہوتا جارہا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی کے پاس انشائیہ میں طنز و مزاح مباح ہے تو دوسرے کی نظر میں اس کا وجود انشائیہ کی صفت کو مجروح کردیتا ہے۔ بعض ادیب انشائیہ میں قوم کی اصلاح کا پیام ڈھونڈتے ہیں تو بعض دوسرے اسے ایک عیب قرار دیتے ہیں۔ کوئی پروفیسر انشائیہ میں قصہ گوئی کو کفر سمجھتا ہے تو کسی کے پاس قصہ گوئی جائز ہے۔ کسی کے پاس مبالغہ آمیزی کی اجازت ہے تو کسی دوسرے کے پاس یہ شرک سے کم نہیں۔ سید محمد حسنین کا یہ مقولہ مجھے اچھا لگا کہ ایک انشائیہ کو بہتے دریا کی طرح رواں دواں ہونا چاہئے۔ میں اس میں اضافہ کرنا چاہوں گا کہ یہ بہتا دریا پہلے بارش کا نہ ہو جو اپنے ساتھ بہت سا کوڑا کرکٹ بہالاتا ہے۔ کئی بارشوں کے بعد ہی صاف و شفاف پانی بہنے لگتا ہے۔ یہ فن مسلسل لکھتے رہنے سے نکھرتا ہے۔ کوئی انشائیہ ہی نہ لکھے نثر کی دوسری اصناف میں طبع آزمائی کرتا رہے قلم سے خود بہ خود انشائیہ پھوٹ نکلے گا۔

اب ہم چند مضامین کا ذرا تفصیلی جائزہ لیں گے جو ۲۰۰۰ء کے بعد سے مختلف رسائل میں خاکہ یا انشائیہ کے عنوان سے چھپتے رہے ہیں۔

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد: پہلے میں ماہنامہ شگوفہ سے شروع کرتا ہوں۔ اس پر الزام ہے کہ وہ معیاری ادب کی نمائندگی نہیں کرتا۔ گذشتہ چالیس سال سے یہ ماہنامہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی ادارت میں بڑی پابندی سے نکل رہا ہے۔ کبھی کبھی اس میں اعلیٰ درجہ کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ جولائی ۲۰۰۸ء کے شگوفہ کا حوالہ ہے۔ اس میں نادر خاں گِروہ کا ایک مضمون خاکہ کے عنوان سے علیم خان فلکی پر لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں حضرات سعودی عرب میں رہتے ہیں۔ میں ان سے واقف نہیں ہوں۔ میں اس مضمون کو خاکہ نہیں بلکہ سوانحی انشائیہ کی ایک اچھی مثال سمجھتا ہوں۔ اسلوب نہایت شگفتہ اور دلکش ہے۔ زبان و بیان کے ساتھ تخیل کی فراوانی ہے۔ مزاح نہ ہونے کے برابر ہے باوجود یہ کہ علیم خان فلکی لطیفہ گو مزاج کے حامل ہیں، ان کے ایک اور دوست نعیم جاوید ہیں جو بڑے ہی ادق مضامین لکھتے ہیں۔ نعیم جاوید کے بارے میں نادر خان لکھتے ہیں کہ ان کے مضامین پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ آپ لغات کے صفحات پڑھ رہے ہیں۔ اس کے بعد فلکی کا یہ شگفتہ انداز اپنے دوست کی تحریر کے بارے میں جس میں ہلکا مزاح بھی شامل ہے ملاحظہ ہو۔ ’’بھائی تم ایک گلاس دودھ میں ایک چمچہ پانی ملاتے ہو، اتنا گاڑھا ادب بھلا کون ہضم کرے‘‘۔ اب آگے فلکی کا حال جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ مجھے خاکہ سے زیادہ انشائیہ لگا۔

’’اس کام میں مصروف اُس کام میں مشغول، اِدھر موجود، اُدھر موجود۔ فلکی تقریباً پندرہ ملکوں کی سانس لے چکے ہیں لیکن فلکی نے شاید ہی کبھی جدہ کے بحرہ احمر کے کنارے اپنی زندگی کو بریک لگا کر پارک کیا ہو اور پتلون کے پائنچوں کو گھٹنوں تک اٹھا کر کھارے پانی میں اپنے پاؤں ہلکے کئے ہوں۔ پھر ڈوبتے سورج کے انتظار میں ریت کے فرش پر کروٹ لیٹ کر انگلیوں سے آڑھی ترچھی لکیریں کھینچی ہوں اور اپنی الجھن سلجھائی ہو‘‘۔

خیال بصیرت افروز ہو ضروری نہیں ہے۔ یہاں تخیل کی ضرورت تھی۔ وہ پوری ہوئی ہے۔ قاری اس منظر کا جیسے خود سے مشاہدہ کررہا ہو۔ پندرہ ملکوں کی سانس لینا، زندگی کو بریک لگا کر

بحرہ احمر میں پارک کرنا اور کھارے پانی میں پاؤں ہلکے کرنا ایسے محاورے ہیں جو خود مصنف کی ایجاد ہیں۔ کھارے پانی کے مقابلے میں میٹھا پانی ہلکا ہوتا ہے۔ اس خوب صورتی سے پاؤں ہلکے کرنے کی بات کہی گئی ہے کہ محاورہ کا تاثر دوبالا ہوجاتا ہے۔ غرض پورے مضمون پر خاکے سے زیادہ انشائیہ کی چھاپ ہے۔

شگوفہ کے اسی شمارہ میں نعیم جاوید کا میں نے وہ مضمون بھی پڑھا جو ''مہینہ کا آخری ہفتہ'' کے عنوان سے چھپا ہے۔ اسے میں خاکہ قرار دیتا ہوں اور یہ خاکہ موضوعاتی ہے۔ اس میں مزاح کی چاشنی ہے۔ مبالغہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں ابہام بھی ہے جو شاید نعیم جاوید کی لغت دانی کا اثر ہے۔ ابہام سے تحریر کی وقعت بڑھتی ہے، گھٹتی نہیں۔ اسے صرف مضمون سمجھنا فن پارہ اور مصنف دونوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

ماہنامہ نیاورق: مضمون کی بات آگئی تو میں یہاں ایک تازہ حوالہ دیتا ہوں۔ ساجد رشید اس کے مدیر ہیں۔ ''نیاورق'' جنوری تا جون ۲۰۰۸ء کے ۲۹ویں شمارہ کا وبھوتی نارائن رائے کی ایک تحریر ''بے چین کرتی ہیں کتابیں'' کے عنوان سے اس رسالے میں شائع ہوئی ہے۔ یہ ترجمہ ہے، جاوید نظر اس کے مترجم ہیں۔ مضمون اس کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی جملے ہیں۔

''آپ ہمیں ایسی کتابیں کیوں بھیجتے ہیں؟''

''کیسی کتابیں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''یہی کتابیں جو لائبریری میں آتی ہیں۔ انہیں پڑھ کر ہمیں بے چینی ہونے لگتی ہے''۔

سامنے مانشی کھڑی تھی۔

یہ کس زبان کا ترجمہ ہے نہیں معلوم۔ ممکن ہے اُس زبان میں اسے مضمون ہی کہتے ہوں۔ اردو میں اس طرح کی عبارت کہانی میں لکھی جاتی ہے۔ ابتداء ہی نہیں بلکہ شروع سے آخر تک عبارت کا یہی انداز ہے۔ تصدیق کے لئے درمیانی عبارت بھی حاضر ہے۔

''حالانکہ مانشی نے نہیں کہا لیکن اس کی بے چینی سے یہ ظاہر تھا کہ جن کتابوں کو وہ پڑھ رہی تھی انہوں نے وہ سارے سوال اٹھادئے تھے، جن سے وہ اب تک بچتی رہی تھی۔ اس کی ساری زندگی کے بارے میں اس کی گھٹن، بھری زندگی کے بارے میں......''

اس کا آخری جملہ ہے

''......مجھے لگتا ہے مانشی بھی اب ان کتابوں کی سنگت نہیں چھوڑ پائے گی جو اسے بے چین کرتی ہیں''۔

شروع سے آخر تک تحریر کہانی کے فارم میں ہے۔ انداز بیان صحافتی ہے۔ نہیں معلوم اسے مدیر نے مضمون کے عنوان سے کیوں چھاپ دیا۔ نقادوں کے ہی نہیں بلکہ مدیروں کے فیصلوں سے نومشق ادیب بھٹک سکتے ہیں۔

ماہنامہ سب رس: ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کا ترجمان ایک تاریخ ساز رسالہ ہے۔ تحقیقی اور ادبی مضامین اس میں کثرت سے چھپتے رہے ہیں۔ ادھر پروفیسر مغنی تبسم کی خرابی صحت کے باعث ان کی توجہ کم ہوگئی ہے۔ اس کے باوجود یہ رسالہ ہر ماہ بڑی پابندی سے شائع ہورہا ہے۔ مارچ ۲۰۰۸ء کے شمارہ میں پروفیسر عصمت آراء کی ایک تحریر ''قسمت کے کھیل'' اور اپریل ۲۰۰۸ء کے شمارہ میں پروفیسر شمیم علیم کی تحریر ''آنسو ہی آنسو'' کے عنوانات سے شائع ہوئے تو دونوں کو انشائیہ کہا گیا ہے۔ دونوں ہی انسانی ہمدردی کی اچھی مثالیں ہیں۔ واقعات کہانی کے انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ ایسی کہانیاں ایک زمانے میں دہلی سے نکلنے والے رسالے بیسویں صدی میں چھپا کرتی تھیں۔ ان میں قارئین کے لئے درس بھی ہوا کرتا۔ اخلاق کو درست کرنے کی تلقین کی جاتی۔ عصمت آراء نے اسپین میں ہونے والی بل فائٹ (بیلوں کی لڑائی) کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ جب ہم کہانی کے انجام کو پہنچتے ہیں تو بل فائٹ کی تمہید غیر ضروری لگتی ہے۔ یہ ایک کامیڈی ہے۔ پروفیسر شمیم علیم کی کہانی ایک ٹریجڈی ہے۔ اس میں بھی ابتدائی دور کی کہانی کا

اسلوب بیان ہے۔ دونوں تحریریں جو کہانیوں کے فارم میں ہیں، صحافتی انداز کی ہیں۔ تعجب ہے کہ دونوں بھی پروفیسر ہیں۔ انہیں صحافتی مضمون کہانی اور انشائیہ کا فرق بالکل نہیں معلوم ہے۔ ان مضامین کے مقابلے میں یوسف ناظم کا مضمون ''حقہ کلچر واپس آرہا ہے'' پڑھیں۔ یہ جولائی ۲۰۰۸ء کے شمارہ میں انشائیہ کے عنوان سے چھپا ہے۔ یہ تو پروفیسر نہیں رہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ انشائیہ سے کسی طرح کم کوئی دوسری صنف کا مضمون ہے۔ اس کے برخلاف احمد آباد سے شائع ہونے والے دوماہی رسالے گلبن ۲۰۰۰ء میں یوسف ناظم ہی کا ایک مضمون ''مشاعروں کی ولادت باسعادت مدت رضاعت'' شامل ہے۔ یہ رسالہ خاص انشائیہ نمبر ہے۔ مرتبین نے اس مضمون کو انشائیوں میں شمار کیا ہے۔ کہاں تک صحیح ہے اس کا ذکر گلبن رسالہ کی ذیلی سرخی کے تحت آئے گا۔
اس سے قبل ایک اور ماہنامہ فنون (اورنگ آباد) کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

ماہنامہ فنون: کا تازہ ترین شمارہ ہے۔ ستمبر ۲۰۰۸ء کی اشاعت ہے اور میں یہ تحریر ستمبر ۲۰۰۸ء کے پہلے ہی ہفتہ میں قلم بند کررہا ہوں۔ جو مضمون انشائیہ کے اعلان سے چھپا ہے اس کا عنوان ہے ''ڈاڑھی مدلل'' عنوان پڑھ کر ہی شبہ ہوتا ہے کہ یہ انشائیہ نہیں ہوسکتا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اُس نے انگریزی کے انشائیہ نگار اسٹیفن لی کاک کے انشائیہ "A Sermon on shaving" سے متاثر ہوکر یہ مضمون لکھا ہے۔ لی کاک نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ آدمی ڈاڑھی رکھے تو مستقل رکھے نہیں تو اسے روز روز مونڈھے۔ لی کاک نے غالباً اسے اپنے (Essay) کہا ہوگا کہ جس کے انگریزی میں معنی مختلف ہیں۔ وہ ایک سیدھا سادہ مضمون بھی ہوسکتا ہے اور انشائیہ بھی جبکہ اردو میں انشائیہ ایک مخصوص صنف ادب ہے۔ اس میں الم غلم باتیں نہیں لکھی جاسکتیں۔ مصنف کا نام ہے ڈاکٹر قمرالزماں۔ اقتباس پیش ہے۔ ''ڈاڑھی سے ایک گاؤدی بھی عقلمند لگے۔ ایک مسخرہ بھی باوقار دکھائی دیتا ہے۔ ایک شہدا بھی متبرک دکھائی دینے لگتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس کی آڑھ میں لوگ بہت سی نازیبا حرکتوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں تو کسی بھی چیز کا بیجا استعمال غلط ہی کہلائے

گا''۔ مضمون صرف ایک صفحہ کا ہے۔ آخر میں انہوں نے اکبرالہ آبادی کا ایک شعر پیش کیا ہے۔

بڑھائی شیخ نے ڈاڑھی اگرچہ سن کی سی　　　مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اس اقتباس کو پیش کرنے کے بعد مزید لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اسی شمارہ میں ایک دوسرا مضمون ''ذکر اس کا اسی بہانے سے'' چھپا ہے۔ یہ مضمون کسی خاتون انورادھا شرما کی رحلت سے متعلق احمد وصی نے لکھا ہے۔ مضمون کی ابتداء میں انتظار حسین کی ایک تحریر ''دلی تھا نام جس کا'' کا حوالہ ہے۔ قلم کار انتظار حسین کے مضمون سے متاثر ہے۔ مرحومہ سے پہلی ملاقات کا ذکر جن الفاظ میں کیا گیا ہے اُسے پڑھ کر ہی گمان ہوتا ہے کہ یہ مضمون انشائیہ ہوسکتا ہے۔ لکھا ہے ''پہلی ملاقات میرے یاد کے پردے پر پرچھائیں کی طرح ہے''۔ خاتون کے خدوخال کا نقشہ کھینچتے ہوئے تحریر کیا ہے ''آواز میں کھردراپن، صاف ستھری، لکھنوی لہجہ۔ مجھے لگا شامِ اودھ مسکرا رہی ہے''۔ یہ مضمون بھی ایک ہی صفحہ پر ہے۔ مختصر سا لیکن بولتا ہے کہ مجھ میں انشائیہ کے گن ہیں۔

سب رس پھر ایک بار: اس ضمن میں پھر سے سب رس (حیدرآباد) کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ شمارہ جون ۲۰۰۸ء کا ہے۔ ایک مضمون ڈاکٹر انورالسعید اختر نے ڈاکٹر سحر سعیدی پر لکھا ہے۔ اسے خاکہ کہا گیا ہے۔ عنوان ہے ''اس کی باتوں میں گلابوں کی مہک'' اس عنوان ہی سے مصنف کے جمالیاتی ذوق پر روشنی پڑتی ہے اور مضمون سے انشائیہ کی خوشبو مہکتی ہے۔ مصنف نے شاہ ضیاء الدین الحسینی پروانہ کے کلام اور کوائف کی جستجو میں اورنگ آباد کا سفر کیا۔ لکھتے ہیں ''اس صحرانوردی میں کوہ کندن و کاہ برآوردن والا معاملہ ہوتا ہے۔ بہ ہر کیف میں اپنی دھن میں جونک کی طرح لگا رہا''۔ بشر نواز سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اپنی الماری سے ایک تحقیقی کتاب نکال کردی تو اس کے بارے میں لکھا ''دوسرے لمحہ میں میرے ہاتھ میں ایک تحقیقی مقالہ بعنوان ''شیخ چاند حیات اور

ادبی خدمات، از ڈاکٹر سحر سعیدی کیسۂ زر کی طرح ڈول رہا تھا'' اور جس وقت وہ سحر صاحب سے ملے تو اُن کے بارے میں لکھا ''وہ نہایت دیدہ زیب شیروانی، اسی کپڑے سے بنی کشتی نما ٹوپی اور اس کے پیچھے لہراتے ہوئی ان کی مرغولے دار زلفیں، چہرے کی مناسبت سے ترشی ہوئی داڑھی، ناک پر متوازن عینک، منہ میں بہترین خوشبودار پان دبائے ہوئے ہشاش بشاش جیسے کسی عمدہ غزل کی تخلیق کے بعد نکھر کے آئے ہوں۔ ہم دونوں گویا ہوئے تو ان کی خوش بیانی سے گلابوں کی مہک آنے لگی، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ گلوں کی کیاریاں اپنے دوش پر سنوارے ہوئے ہیں......''

''سحر صاحب کے سینے میں ایک حساس اور دردمند دل ہے اسی لئے انہوں نے اپنے دل کی دھڑکن کو عشق کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا ہے۔ آج تک وہ دھڑکن اور اس کی کسوٹی ان کے آنگن میں پھل پھول رہے ہیں۔ سحر صاحب نے اپنے ذہن کے بربط پر دل کے مضراب سے جنبش دی اور اس کی موسیقی کو میر تقی میر کے دردوغم کے ساتھ اشعار میں ڈھال دیا۔ غالب کے فلسفہ، عشق اور رمزِ حیات کے موضوعات کو کمندِ حیات سے زیر دام کیا۔'' اس مضمون کو میں خاکہ نہیں بلکہ ایک عمدہ سوانحی انشائیہ سمجھتا ہوں۔

جون ۲۰۰۸ء کے اسی سب رس میں پروفیسر شمیم علیم کا ایک مضمون ''گھٹنے ٹیک دیئے'' انشائیہ کے عنوان سے چھپا ہے۔ یہ صحافتی اسلوب کا محض ایک مضمون ہے۔ خاکہ بھی نہیں کہلایا جاسکتا۔ صرف ابتدائی جملے کے چند الفاظ پر توجہ دی جاسکتی ہے۔ ''بیٹی کچھ نہ کرے کم از کم ماں باپ کا خیال تو کرتی ہے، محبت تو کرتی ہے، ان کے لئے تڑپتی ہے۔ خواہ وہ پنجرہ میں بند ہی کیوں نہ ہو''۔ یہ ایک پنجرہ میں بند ہونے والا تصور ہی تلازمہ ہوسکتا ہے۔ باقی سارے مضمون کی عبارت ایک واقعہ جیسی ہے جو ہم آپس میں کبھی ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ چند محاورے استعمال ہوئے ہیں جیسے ''گھٹنے ٹیک دیئے، چکی کے بیچ پستے رہے، سڑکیں ناپتے رہے، پیروں تلے زمین نکل گئی، پانی سر سے اونچا ہوگیا اور گڈے گڑیوں کا کھیل ہوگیا''۔ اس مضمون کا ایک معمولی سا پلاٹ بنتا

ہے۔ ایک مسلمان لڑکے نے ایک عیسائی لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ بیٹے کے اصرار کے سامنے ماں باپ نے آخر کار گھٹنے ٹیک دیئے۔ طے ہوا کہ لڑکی کے والدین کی خاطر رجسٹرڈ میرج کرلی جائے اور لڑکے کے اماں باوا کی خاطر نکاح۔ بعض نقادوں نے قصہ کو انشائیہ میں کفر قرار دیا ہے۔ اس سے قطع نظر اسے انشائیہ کیسے کہیں نہ تو زبان میں فصاحت و بلاغت ہے، نہ اسلوب میں شگفتگی، نہ تخیل کی کارفرمائی اور نہ ہی موضوع میں کوئی ندرت۔ اگر ان خصوصیات سے یہ مضمون مالا مال ہوتا تب بھی قصہ کا پلاٹ اسے مجروح کردیتا اور یہ انشائیہ کی زمرہ میں نہ آتا۔ ان خامیوں سے قارئین اور نومشق ادیبوں کو آگاہ نہ کیا جائے تو انشائیہ کے پکھوے کا راستہ ہی میں کچومر نکل جائے گا۔

دوماہی گلبن احمدآباد: اب ہمیں جائزہ لینا ہے ایک ایسے دوماہی رسالے کا جسے انشائیہ نمبر کہا گیا ہے۔ یہ احمدآباد سے نکلتا ہے۔ انشائیہ نمبر نکالنے کے لئے حیدرآباد (دکن) سے رؤف خیر اور لاہور سے منور عثمانی کو دعوت دی گئی۔ یہ حضرات انشائیہ نمبر کے مرتبین ہیں۔ جنوری تا اپریل ۲۰۰۱ء کا شمارہ ہے۔ پتہ ہے: F.2 Rose Apts. Kocharb Paldy, Ahmedabad-38006

پہلے باب میں انشائیہ اور انشائیہ نگاری پر وزیر آغا، منور عثمانی اور سیدہ جعفر کے مضامین ہیں۔ بعد کے تین ابواب میں ہندوستانی گوشہ سے منتخب اور غیر مطبوعہ سترہ مضامین ہیں۔ پاکستانی گوشہ سے اٹھارہ مطبوعہ ہیں اور غیر مطبوعہ گوشے میں بارہ مضامین ہیں۔ اس طرح اس خاص نمبر میں جملہ سینتالیس مضامین انشائیوں کے عنوان سے شائع کئے گئے ہیں۔ ان میں کے میں نے کل انیس مضامین پڑھے۔ سارے کے سارے پڑھ لیتا اگر چالیس، پچاس فیصد ہی مجھے انشائیہ جیسے لگتے۔ انیس مضامین میں مجھے صرف پانچ پسند آئے۔ یوسف ناظم کا مضمون انشائیہ نہیں ہے۔ مصنف سے فرمائش کرکے لکھوایا جائے تو نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوسکتا یا پھر آپ کسی ادیب کو دوستی

کی بنیاد پر انشائیہ نگاروں میں شامل کرنا چاہیں تو تب بھی یہی حشر ہوگا۔ اس نے پہلے سے کبھی انشائیے لکھے ہی نہیں ہیں تو اچانک آپ کی خواہش پر انشائیہ نگار کیسے بن جائے گا۔ گلبن کے انشائیہ نمبر میں وزیر آغا کے دو انشائیے چھپے ہیں۔ میری ''چالیسویں سالگرہ''، مطبوعہ ہے اور ''آنکھیں'' غیر مطبوعہ۔ میری ''چالیسویں سالگرہ'' زیادہ شخصی ہے اور وزیر آغا کے اطراف گھومتا ہے۔ ''آنکھیں'' ایسا انشائیہ ہے جس میں قاری کو اپنی آنکھوں کے علاوہ دوسروں کی آنکھوں کا بھی خیال ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''آنکھ کو آپ چاہیں تو آئینہ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مگر نہیں! آئینہ میں تو صرف باہر کی چیزیں منعکس ہوتی ہیں۔ آنکھ تو جامِ جہاں نما کی طرح ہے کہ اس میں لحہ بہ لحہ نئے نئے عکس پیدا ہورہے ہوتے ہیں۔ یہ سارے عکس باہر سے آئے ہوئے ریزوں یا آبدار شعاعوں سے منعکس نہیں ہوتے بلکہ از خود اندر کے ''ناموجود'' سے ابھرتے ہیں۔ کئی بار میں نے سوچا کہ ابتداء میں شاید آنکھ تھی...... ایک بے کنار محیط و بسیط آنکھ جو خلاء کو گھور رہی تھی پھر اچانک اس آنکھ کے اندر عکسوں کا لامتناہی سلسلہ موجزن ہوگیا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں کہ عکسوں کا یہ سمندر آنسوؤں میں ڈھل کر اپنے کناروں سے چھلک گیا......''

یہ ممکن نہیں کہ میں اُن تمام مضامین پر اپنا ردِعمل ظاہر کروں جن کا میں نے مطالعہ کیا ہے۔ چند مضامین کے بارے میں ضرور کہوں گا ورنہ میرے مطالعہ کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔ یوسف ناظم کے مضمون کا عنوان ''مشاعروں کی ولادت باسعادت، مدت رضاعت اور رفتہ رفتہ ترویج و اشاعت'' یہ طویل عنوان اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ اس میں مشاعروں کی ابتداء اور ان کی ترویج کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ مضمون پڑھ چکا تو میرا اندازہ صحیح نکلا۔ اگر خود یوسف ناظم سے پوچھا جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اسے انشائیہ سے تعبیر نہیں کریں گے۔ اس میں بڑی محنت سے مواد اکٹھا کیا گیا ہے اور ترتیب اس سلیقہ سے کی گئی ہے کہ قاری کی معلومات میں اضافہ ہو۔ عبارت نہایت

شگفتہ اور دلکش ہے۔ انشائیہ نگار کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ لکھتے ہوئے وہ اپنے خیالات میں گم ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ ایک انشائیہ طبع زاد ہوتا ہے۔ تاریخی معلومات حاصل کرنے کے لئے شخصیتوں اور مقامات کے نام کے علاوہ واقعات کی تفصیل بھی حاصل کرنی ہوتی ہے اور لکھتے ہوئے ان تفصیلات کو اپنی جگہ بٹھانا ہوتا ہے تو مضمون کی نوعیت مختلف ہوجاتی ہے۔ اس بحث کو یہیں پر ختم کرتے ہوئے ایک اور انشائیہ ''حسرت دید'' (مشتاق احمد) کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ انشائیہ کی خصوصیات میں قاری کو مسرت اور فرط انبساط کے لمحے بخشنا بھی شامل ہے۔ مسرت و انبساط ذہنی کیفیتوں کی عکاس ہوتی ہے۔ اس کی متضاد کیفیتیں حُزن و ملال کی ہیں۔ بصارت کے زائل ہوجانے کے واقعہ کو پڑھ کر ایک قاری حُزن و ملال کی کیفیت سے گذرتا ہے۔ اس طرح کے تاثرات پیدا کرنے میں عبارت اپنا منصب ادا کرتی ہے تو وہ مسرت و انبساط کا ہو کہ حُزن و ملال کا، اُس عبارت میں اگر دم خم ہے تو ہم اُسے انشائیہ ہی کہیں گے ''حسرت دید'' اسی طرح کی تحریر سے مملو ہے۔ اس لئے میں اسے انشائیہ ہی کہوں گا۔ ایک اور مضمون جو حزن و ملال کی کیفیت پیدا کرسکتا ہے وہ ایلاف خیری کا ''بہت پچھتائے فریج خرید کے'' ہے۔ انہوں نے فریج تو اپنے اور اپنے اہل وعیال کے آرام کے لئے خریدا تھا لیکن پڑوسیوں نے باری باری سے اس طرح ہلہ بول دیا کہ گھر والوں کو فریج سے استفادہ کا موقع ہی نہیں ملا۔ کسی بھی قاری کو ایلاف خیری یا اُس شخص سے ہمدردی ہوجاتی ہے جس نے فریج اقساط پر خریدا تھا۔ اسے اپنے لئے استعمال کرنے کا موقع ہی نہ ملا اور کمپنی نے اقساط کے ادا نہ ہونے پر فریج واپس لے لیا۔ اسے اگر آپ انشائیہ نہ مانیں تو ایک موضوعاتی خاکہ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین میں بعض دفعہ بڑا ہی نازک فرق ہوتا ہے اس لئے کبھی مصنف کی بات بھی مان لینی پڑتی ہے کہ اس کا مضمون انشائیہ ہی ہے۔ میری عرض یہ ہے کہ مضمون کو کم از کم اُس سطح پر تو آنا ہوگا جہاں ایک منجھے ہوئے قاری کو تمیز کرنے میں دشواری ہو کہ یہ انشائیہ ہے یا نہیں۔

''گلبن'' میں بہت سے انشائیے تین اور چار صفحات پر محیط ہیں۔ بعض تو صرف دو صفحات پر ختم ہوتے ہیں۔ پچھلے دور کے ایسے انشائیوں کو ہم نے رد کردیا ہے جو بہت ہی مختصر تھے۔ ایسی تحریروں کو بھی ہم انشائیہ قرار نہیں دے سکتے جنہیں پڑھ کر ہمیں کراہیت کا احساس ہو۔ اس کے برخلاف محمد بدیع الزماں اور سلیم آغا قزلباش کے مضامین ''غزل کی کہانی غزل کی زبانی'' اور ''گلی'' عمدہ انشائیے ہیں۔

غزل کی کہانی کا انشائیہ کوئی نو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ شروع سے آخر تک تخیل سے مالا مال ہے۔ اقتباس کے لئے کوئی عبارت منتخب کرنا چاہوں تو ہر پیراگراف سے بوئے سخن آئے۔ کس کوکس پر ترجیح دوں فیصلہ مشکل ہے۔ ملاحظہ ہو۔

''روح پرور خلوتیں ہوں یا جانگداز تنہائیاں، قرب کی لذتیں ہوں کہ مہجوری کی تلخیاں، بے نوازیاں ہوں یا دل نوازیاں، عشرتیں ہوں یا سوگواریاں، چاندنی ہو یا اندھیری راتیں، آنسو ہوں یا مسکراہٹیں، کامرانیاں ہوں یا نامرادیاں، مجبوریاں ہوں یا آزادیاں، ناز مجبوری ہو یا رنجش بیجا، شکوۂ بے مہری ہو یا شکر وفا، جذبات ہوں یا تجربات، احساسات ہوں یا واقعات، طوفانِ حوادث ہو یا بامراد، مستقبل کی اُمیدیں ہوں یا ماضی کی یاد...... غرض دنیا سے محبت کی کسی گوشے کی تصویر ہو اور تصویر کا خواہ کوئی سا رخ۔ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں اور ایک ہی باغ کی رنگارنگ کیاریاں ہیں۔ یہ سب ایک تار ہے جو ایک ہی ساز پر بجتا ہے اور وہ تار میں ہوں غزل......''

اب سلیم آغا قزلباش کی ''گلی'' کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

''یہ عقدہ اب کھلا کہ جلوس کے لئے گلیاں پناہ گاہوں اور خندقوں کا فریضہ انجام دیتی ہیں اور سیاہی کی طرح ہجوم کو اپنے اندر جذب کرلیتی ہیں اور ضرورت پڑنے پر ہجوم کو دوبارہ اگل بھی دیتی ہیں۔ یہی نہیں گلیاں تو حملہ آوروں کے خلاف ڈھال کا کام بھی دیتی ہیں......''

گلی کی خوبی یہ ہے کہ ایک گلی دوسری گلی کو کروٹ دیتی ہے''۔ کروٹ دینے کے محاورہ کا استعمال اس سے بہتر کہیں اور پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ ایک آخری اقتباس:

''گلی میں مخالف سمت سے آنے والے دو راہ گیر جب ایک دوسرے کے بالکل سامنے آجاتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں ڈوئل لڑنے والوں کا سا حریفانہ انداز ہرگز نمودار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ایک احترام آدمیت کے جذبہ سے سرشار ہوکر دائیں یا بائیں کی طرف جھک جاتا ہے اور یوں دوسرے کے لئے راستہ ہموار کردیتا ہے۔ گویا گلی کا وجود جھوٹی انا، تکبر اور احساسِ برتری کی بیخ کنی کرتا ہے اور جذبۂ ایثار کو فروغ دیتا ہے......''

''غزل کی کہانی'' اور ''گلی'' موضوعات پر لکھے ہوئے انشائیہ ہیں۔ موضوع کی تحقیر یا توصیف کے بارے میں کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا لیکن سوانحی انشائیوں میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اُس میں مرکزی کردار پر پھبتی نہ کسی جائے۔ خاکہ کا معاملہ اور ہے۔ کسی سوانحی خاکہ کا کردار ضروری نہیں کہ معزز و معتبر ہو لیکن سوانحی انشائیہ میں اس کی حیثیت ایک ممدوح کی ہے۔ خاکہ میں کردار کا مذاق اڑایا جاسکتا ہے۔ اس کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے مزاح پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن سوانحی انشائیہ نگار اپنے ممدوح کے بارے میں ایسا نہیں کرسکتا۔ اول تو ایک انشائیہ میں طنز و مزاح کی گنجائش نہیں ہے۔ دوم یہ کہ مرکزی کردار مصنف کا ممدوح ہے۔ ہم اپنے ممدوح کے کمزور پہلوؤں سے نظریں چرالیتے ہیں۔ کمزور پہلوؤں کا اگر ذکر کرنا ہی ہے تو انشائیہ کیوں لکھیں، خاکہ کیوں نہ لکھیں۔ کسی ایسے دوست کو سوانحی انشائیہ کا موضوع بنایا جاسکتا ہے جس میں بہت ساری خامیاں ہوں لیکن اس کی بعض خوبیاں مثالی ہوتی ہیں۔ کم از کم مصنف کے پاس تو اس کا یہی امیج ہے۔ مصنف اگر اپنے ممدوح کی خامیوں کا ذکر بھی کرے گا تو عیب جوئی سے پہلوتہی کرے گا۔ مصنف کے اس عمل سے قارئین کے ساتھ ناانصافی بھی نہیں۔ کوئی بھی شخص اپنے دوست کی خامیوں اور خوبیوں کو ترازو کے پلڑوں میں تولنا نہیں چاہے گا۔ البتہ قاری کو یہ اختیار پہنچتا ہے۔ وہ جانچتا ہے کہ مصنف نے اپنے کرداروں کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے اور کس حد تک نہیں۔ تاہم وہ یہ جانتا ہے کہ وہ ایک انشائیہ کا مطالعہ کررہا ہے کسی خاکہ کا نہیں۔

آیئے ہم ایک ایسے کالم نگار/ خاکہ نگار کے بارے میں گفتگو کریں جس کی تحریروں میں

کہیں کہیں انشائیہ پن ہے۔ تخیل کے سبب اور بہ اعتبار اسلوب۔

بارے مجتبیٰ حسین: مجتبیٰ حسین کالم نگار بھی ہیں، خاکہ نگار بھی اور مزاح نگار بھی۔ ان کا کام بہت پھیلا ہوا ہے۔ ان کی ابھی تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سفرنامے بھی ہیں۔ جب سے مجتبیٰ حسین روزنامہ سیاست حیدرآباد سے وابستہ ہوئے ہیں انہوں نے شاید ڈھائی ہزار سے زائد کالم لکھے ہیں۔ اکثر کالموں کو خاکے بھی کہا گیا ہے۔ الگ سے سوانحی اور موضوعاتی خاکے بھی لکھے ہیں۔ ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ان کے سفرنامے بھی خاصی شہرت پا چکے ہیں۔ پچاس پچپن سال سے جس مصنف کا قلم مسلسل متحرک رہا ہو، اس کی گنتی بسیار نویسوں میں تو ہوگی۔ بڑے ادیبوں میں بھی ہے۔ ادھر میں نے محسوس کیا کہ ان کے کالموں میں انشائیہ نگاری کے اوصاف بڑی شدت سے ابھر آئے ہیں۔ ویسے وہ اس الزام سے بری نہیں ہو سکتے کہ انہوں نے جہاں جہاں موقع ملا یا نہ بھی ملا تو موقع نکال کر اپنے بارے میں لکھا ہے۔ ان کی یہی خامی ان کے دوستوں اور دشمنوں میں نزاعی گفتگو کا موضوع بنی ہے۔ اس وقت اپنی گفتگو کو میں ان کے صرف دو کالموں تک محدود رکھتا ہوں۔ یہ دونوں کالم انشائیہ کی صفات سے معمور ہیں بلکہ انشائیہ کہلائے جا سکتے ہیں۔ ایک تو ان کا صدارتی خطبہ ہے جسے انہوں نے حیدرآباد کے ماہر تعلیم محمد اسحٰق کی کتاب ''تعلیم ایک تحریک ایک چیلنج'' (چھٹا ایڈیشن) کی رسم اجراء کی تقریب میں پڑھا۔ دوسرا مضمون ہے ''ہم امریکہ سے بول رہے ہیں''۔ یہ دونوں مضامین روزنامہ سیاست کے سنڈے ایڈیشن میں میرا کالم کے تحت چھپے ہیں۔ اول الذکر کا عنوان ہے۔

''رہنماؤں کی لوریاں اور تعلیمی بیداری'' کتاب نما اگست ۲۰۰۸ء کے شمارہ میں عطاء اللہ خان سنجری کہتے ہیں ''سماج کا سدھار انشائیہ نگار کا نصب العین ہونا چاہئے''۔

میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ ادب میں Rhetorics (خطیبانہ طرز بیان) آجائے تو وہ مذہب کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اعلیٰ و ارفع ادب کی پہچان یہ ہے کہ وہ اخلاقیات کا درس راست نہ دے۔ اچھا ادب قاری کے زخموں پر پھاہا بھی رکھتا ہے اور اُسے دوسروں کے دکھ درد

میں شریک ہونے کی چپکے چپکے سے تلقین کرتا ہے۔ یہ زیادہ موثر ذریعہ ہے۔ انشائیہ تو نثر کی سب سے اونچی صنف ہے۔ تبلیغ کرنا یا مبلغ کی باتیں سننا دونوں بوجھ کے کام ہیں۔ انشائیہ اس بوجھ کا متحمل ہے نہ اس کا یہ منصب ہے۔ انسانوں کے غم کا مداوا ہر بڑے ادب کا منصب ضرور ہے لیکن یہ کام ایک انشائیہ ڈھنڈورا پیٹ کر نہیں کرتا۔ سمندر کی سطح پر طوفان کا زور تو ہمیں دکھائی دیتا ہے لیکن سمندر کی پوری طاقت تو اس کی زیریں لہروں میں ہوتی ہے۔ اور یہ لہریں اندر ہی اندر پانی کو سرد و گرم کرنے کی صفات رکھتی ہیں۔ ایک انشائیہ بھی اسی سطح پر کام کرتا ہے۔ جن کالموں کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں مجتبیٰ حسین سماج سدھار کا کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وصف اُن کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔

''رہنماؤں کی لوریاں اور تعلیمی بیداری'' مضمون کی اُٹھان ہی اس پہاڑی ندی کے بہاؤ کی طرح ہے جو ابتداء میں ایک جھرنے کی طرح پھوٹتی ہے۔ آہستہ آہستہ اس کا بہاؤ بڑھتا ہے اور وہ شور شرابے میں تبدیل ہو کر آخر میں سمندر میں مل جانے سے قبل اپنی کمر خمیدہ کر لیتی ہے۔ دیکھنے والے کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ندی کا پانی کہاں ختم ہو رہا ہے اور سمندر کا کنارہ کہاں سے شروع ہو رہا ہے۔ مجتبیٰ اپنے کو کم علم اور کم سواد کہتے ہوئے مضمون شروع کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسا پائلٹ نہیں ہیں جو ہوائی جہاز تو چلا سکتا ہے لیکن سرکار چلانا اُس کے بس میں نہیں (آج کل تو سرکار کوئی کائیاں آدمی ہی چلا سکتا ہے)۔ آگے کسی تاریخی فلم کے ایک مکالمے کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''جس نے بابر کی تلوار دیکھی ہو اب وہ کسی کی تلوار نہیں سمجھتا''۔ اور جب امور مملکت کا حوالہ آتا ہے تو وہ قوم کو یاد دلاتے ہیں کہ پارلیمنٹ میں ایسے ارکان بھی موجود ہیں جو کئی جرائم میں ملوث ہیں۔ ان ہی پارلیمنٹ کے ممبران نے موجودہ دور میں ہماری درس گاہوں میں آدمی کو انسان بنانے کا سلسلہ ختم کر دیا ہے۔ فیس کے بہانے طلبہ کے سرپرستوں کی کھال کھینچ لی جاتی ہے۔ سرسید احمد خان کا وہ مشن (Mission) جس کے ذریعہ حصول تعلیم کا بیڑا اٹھایا گیا تھا اب وہ مشین (Machine) میں تبدیل کر دیا گیا ہے، جہاں چیزیں بنانے والوں کو ڈھالا جاتا ہے۔ آگے

بڑھتے ہوئے مجتبیٰ حسین قارئین کو خرگوش و کچھوے کی کہانی یاد دلاتے ہیں۔ کہانی تو بچوں کے لئے ہے لیکن موقع محل سے سنائی جائے تو بالغوں کو پسینہ آجائے۔ کہتے ہیں ''مسلمانوں اور یہودیوں کی دوڑ، چودہ برس سے چلی آرہی ہے، ابتدائی چھ سات صدیوں میں مسلمان تیز رفتاری سے دوڑ کر بہت دور پہنچ گئے۔ خوش اعتمادی نے ان پر نیند کا غلبہ طاری کردیا''۔ پھر کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے۔ آپ مضمون پڑھ کر ہی اس کی تہہ تک پہنچ پائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ عبارت کو مختصر کرکے قاری کے مطالعہ کا لطف ضائع کردوں۔ اگر یہ کالم کسی کی نظر سے نہیں گذرا ہے تو مستقبل میں مجتبیٰ کی کسی نہ کسی آنے والی کتاب میں مل جائے گا (شگوفے میں چھپ چکے ہیں) مزید دو ایک جملوں کا یہاں حوالہ دینا چاہوں گا۔ ابھی تو یہ ندی اپنے بہاؤ کی جولانی دکھا رہی ہے۔ لکھتے ہیں۔

''مسلمانوں اور اونٹ میں گہری مماثلت ہے۔ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا پیش قیاسی نہیں کی جاسکتی۔ کیا وہ دن بھی کبھی آئے گا جب بہتر اونٹ ایک ہی کروٹ بیٹھ جائیں گے۔ مسلمانوں کے پاس بھی اونٹ ہی کی طرح ایک عظیم الشان ماضی کا کوہان موجود ہے''۔ پورے مضمون میں محاورہ کی زبان اور ضرب الامثال کا استعمال ہوا ہے۔ ساتھ میں تخیل کی فراوانی اس مضمون کو انشائیہ سے قریب تر کردیتی ہے۔

اب اُس آخری مضمون کا بھی ذکر کردیتا ہوں جو ''ہم امریکہ سے بول رہے ہیں'' کے عنوان سے ۱۳ اگست ۲۰۰۸ء کے سیاست میں چھپا ہے۔ اس مضمون میں بھی زبان و بیان کی شگفتگی کے ساتھ رواں دواں اسلوب اور تخیل کی فراوانی ہے۔ ممبئی تا شکاگو کوئی ۲۳ گھنٹوں کا سفر ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں ''کوئی سوئے تو کب تک سوئے اور اس لمبے سفر کے دوران کروٹ بدلنا چاہے تو کیوں کر بدلے۔ اپنی ذات کو سمیٹ کر ہوائی جہاز کی نشست میں ایک مشتِ خاک کی طرح بیٹھنا بھی ایک فن ہے۔ مجتبیٰ سے جب کہا گیا کہ آپ کو تو اکزیکیٹو کلاس میں ہونا چاہئے تو خیال ظاہر کرتے ہیں...... ''ہم لوگ اپنی حیثیت کی چادر کو دیکھ کر اپنے پاؤں سمیٹنے کے قائل ہیں۔ وہ لوگ اور ہوتے ہیں جو اپنی حیثیت کی چادر کو کوتاہ دامنی میں سمیٹنے کے بجائے اپنے پاؤں کاٹ لیتے ہیں'' (یہاں

پاؤں کاٹ لینے کا مفہوم کچھ اور ہی ہے) درمیان میں میاں بیوی کے مکالمے اور امریکہ کا دوسروں کے گھروں میں مداخلت کرنے کا ذکر بھی بڑی تہہ داری سے کیا گیا ہے۔ مزاح کی عمدہ مثال ہے۔

''منہ میں نوالہ سر پر ٹھولہ'' کی کہاوت بامحل اور برجستہ ہے۔ ایرپورٹ پر ملنے کے لیے آئے ہوئے احباب میں حسن چشتی بھی تھے۔ آنکھوں کے آپریشن اور بینائی کی کمزوری کی وجہ پیچھے پیچھے آنے والی حسین خاتون مسافر سے بے ساختہ لپٹ کر والہانہ رونے ہی والے تھے۔ خاتون جہاں دیدہ تھیں، آگے کو نکل گئیں۔ اس واقعہ میں مبالغہ آمیزی جھوٹ کی سرحدوں کو چھوتی ہے۔ تاہم احتمال کی گنجائش، انشائیہ میں جائز ہے۔ قاری اسے پڑھ کر محظوظ ہوتا ہے اور بیان کی شگفتگی کی بدولت انبساط سے گذرتا ہے۔ استقبال کے لئے آنے والے دوستوں میں خورشید خضر بھی تھے۔ کوئی پینسٹھ برس قبل مجتبیٰ کے ہم جماعت تھے۔ اس کے باوجود پڑھ لکھ کر تعلیم یافتہ بن گئے۔ یہاں مجتبیٰ نے خود اپنے پر پھبتی کسی ہے۔ مضمون کے اختتام پر آپ کو پھر ایک بار مجتبیٰ کا تخیل کارفرما نظر آئے گا۔ کہتے ہیں ''سفرنامے کی اس پہلی قسط کو آپ کسی ہوائی اڈے پر دوڑنے والے ہوائی جہاز کی سطح سمجھیں۔ ذرا ذہنی یکسوئی میسر آتے ہی ہمارا سفرنامہ ٹیک آف کرے گا۔ اپنی کرسی کی پٹی آپ اچھی طرح باندھ لیں''۔

یہ مضمون کالم نگاری کے زیرعنوان چھپا ہے۔ اس میں مزاحیہ نگاری بھی ہے خاکہ نگاری بھی اور ان سب سے بڑھ کر انشائیہ نگاری کے پورے لوازم موجود ہیں۔ اُن اقتباسات اور مضامین کے حوالوں سے مقابلہ کرلیجئے جو اس مقالے میں زیر بحث آئے ہیں...... عنوان بدل دیجئے ''کالم'' کی جگہ ''انشائیہ'' اس لئے کہ میں ابھی انشائیہ تک نہیں پہنچا ہوں۔ سوئے انشائیہ ہوں۔

نومبر ۲۰۰۸ء

•❖•

○

انشائیه نے گذشته دیڑھ سو سال میں جو ارتقائی منازل طے کئے ھیں اس کی رفتار کچھوے کی چال جیسی لگتی ھے۔ کبھی کبھی یه دیکھ کر افسوس ھوتا ھے که یه کچھوا راسته بھٹك کر منزل سے دور ھوتا جارھا ھے۔ اس کا ایك سبب یه بھی ھوسکتا ھے که کسی کے پاس انشائیه میں طنز و مزاح مباح ھے تو دوسرے کی نظر میں اس کا وجود انشایه کی صفت کو مجروح کردیتا ھے۔ بعض ادیب انشائیه میں قوم کی اصلاح کا پیام ڈھونڈتے ھیں تو بعض دوسرے اسے ایك عیب قرار دیتے ھیں۔ کوئی پروفیسر انشائیه میں قصه گوئی کو کفر سمجھتا ھے تو کسی کے پاس قصه گوئی جائز ھے۔ کسی کے پاس مبالغه آمیزی کی اجازت ھے تو کسی دوسرے کے پاس یه شرك سے کم نهیں۔ سید محمد حسنین کایه مقوله مجھے اچھا لگا که ایك انشائیه کو بھتے دریا کی طرح رواں دواں ھونا چاھئے۔ میں اس میں اضافه کرنا چاھوں گا که یه بھتا دریا پھلی بارش کا نه ھو جو اپنے ساتھ بھت سا کوڑا کرکٹ بھالاتا ھے۔ کئی بارشوں کے بعد ھی صاف و شفاف پانی بھنے لگتا ھے۔ یه فن مسلسل لکھتے رھنے سے نکھرتا ھے۔ کوئی انشائیه ھی نه لکھے نثر کی دوسری اصناف میں طبع آزمائی کرتا رھے قلم سے خود به خود انشائیه پھوٹ نکلے گا۔

(سوئے انشائیہ سے ایک اقتباس)

سوانحی انشائیے

اختر حسن

علم وادب اور شائستگی کی ایک انمول شخصیت

کوئی پچپن برس پرانی بات ہے ویمنس کالج دربار ہال میں ایک شخص شیروانی میں ملبوس بین کلیاتی تقریری مقابلے کے جلسہ کی صدارت کی کرسی سنبھالنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا کیا یہ وہی اختر حسن صاحب ہیں جو روزنامہ پیام کے ایڈیٹر تھے۔ اس بین کلیاتی تقریری مقابلے میں ایوننگ کالج حیدرآباد کی ٹیم کا میں ایک نمائندہ تھا۔ تقریر کا عنوان تھا ''کمزور اقوام کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے''۔ میری جب باری آئی تو میں نے صدر جلسہ سے درخواست کی کہ میں مائیک کو سامنے سے ہٹا دینا چاہتا ہوں تا کہ کمزور اقوام کی آواز بغیر مائیک کے دور تک پہنچ جائے۔ صدر نے اجازت نہ دی۔ اقوام ہی کیا افراد بھی کمزور ہوتے ہیں۔ باری باری سے کمزوروں کو ختم کر دیا جائے تو آخر میں صرف وہی شخص باقی رہ جائے گا جو سب سے توانا اور طاقتور ہوگا۔ صدر کی اجازت کے بغیر میں مائیک ہٹا نہ سکتا تھا۔ وہ بات جو میں کہنا چاہتا تھا ویمنس کالج کی طالبہ رقیہ شہناز نے کہہ دی۔ شائستہ زبان اور دلنواز لہجہ۔ اس ٹیم کی دوسری پارٹنر صفیہ تھیں جو ابھی صفیہ اریب نہیں بنی تھیں۔ وہ توانا تھیں اور توانا قوم کی حمایت کر رہی تھیں۔ ٹیم جیت گئی۔

اختر حسن صاحب سے وہ میری پہلی شناسائی تھی۔ شاید وہ مجھے یاد رکھتے اگر ہماری ٹیم جیت جاتی۔ کئی بار انہیں ادبی محفلوں میں دیکھتا اور ان کی تقریریں سنتا رہا۔ قریب ہونے کا موقع اس وقت ملا جب رائٹرس گلڈ کے انتخابات ہوئے۔ میں الیکشن آفیسر نامزد ہوا تھا۔ معتمدی کے لئے اختر حسن صاحب اور حسن عسکری صاحب کے درمیان مقابلہ تھا۔ میرا ووٹ آخری تھا اور اس آخری ووٹ سے اختر صاحب منتخب ہوئے۔ میں عسکری صاحب سے بھی قریب تھا لیکن پہلے ہی انہیں بتا دیا کہ اختر صاحب کو اس لئے ووٹ دوں گا کہ مشاعرہ منعقد کروانے کے لئے وہی زیادہ موزوں شخص تھے۔ اردو کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں تک ان کی رسائی تھی۔ کیفی اعظمی تو ان کے ہم زلف تھے۔ بمبئی کی کئی فلمی شخصیتوں سے مراسم تھے۔ چنانچہ مشاعرہ میں اہم شاعروں کے علاوہ پٹوڈی اور شرمیلا ٹیگور نے بھی شرکت کی۔ رائٹرس گلڈ کے لئے اور مشاعرہ کے اخراجات کے لئے رقم کی ضرورت تھی ورنہ غیر شاعروں کو مشاعرہ میں مدعو کرنے کا خیال اختر حسن صاحب جیسی شخصیت کو کبھی نہ آتا۔ ادیب وشاعر تو وہ خود بھی تھے لیکن ان کی شہرت ایک صحافی اور سیاست داں کی بھی تھی۔ پیام، بلٹز اور ماہنامہ آندھراپردیش کے وہ ایڈیٹر رہ چکے تھے اور تلنگانہ تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں آٹھ ماہ تک جیل میں رہے۔ ہندوستان کے پہلے انتخابات میں جنگاؤں سے ایم ایل اے منتخب ہوئے تھے۔ انتخابات کے زمانے کا واقعہ وہ کبھی کبھی بڑے اشتیاق سے سنایا کرتے۔ انتخابی تحریک چلانے کے لئے انہیں گاؤں گاؤں جانا پڑتا۔ ایک دفعہ عصمت چغتائی بھی ساتھ تھیں۔ کسی گاؤں میں انتخابی مہم کے بعد رات کے کھانے کا انتظام کسی کسان کے گھر پر تھا۔ کھانا پروسنے کے لئے پتر ولیاں پیش کی گئیں۔ عصمت چغتائی اس دور کے ڈپٹی کلکٹر کی بیٹی۔ شمالی ہند کی پیدائش اور بمبئی کی رہنے والی تھیں۔ انہوں نے پتر ولیوں کو شاید پہلے کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ املتاس (پلاس) کے پتوں کی بنی ہوئی پتر ولیوں کو دیکھ کر اچنبھے سے انہوں نے کہا۔ ''ارے ان پتوں میں کوئی کیسے کھائے؟''

ایک دوسرا واقعہ مسز خدیجہ عالم خوندمیری نے سنایا تھا۔ ایک انتخابی مہم کے دوران تمام حضرات کار سے اتر کر پیدل جانے لگے۔ کوئی ذرا آگے اور کوئی پیچھے۔ خدیجہ صاحبہ ٹھوکر کھا کر نالے میں گر پڑیں۔ وہ فوراً اٹھ نہ سکیں۔ اختر صاحب چیخنے لگے۔ ''ارے کوئی انہیں اٹھائے۔ ارے کوئی اٹھائے انہیں''۔ انہوں نے کسی نامحرم کو ہاتھ لگانا مناسب نہ سمجھا اور ایسی کوئی ایمرجنسی بھی نہیں تھی۔ ساتھ چلنے والی دوسری خواتین نے انہیں سہارا دیا، تب یہ قافلہ آگے بڑھا۔

خیر یہ باتیں تو ضمنی تھیں۔ اختر صاحب کی خوبیاں صرف شاعر، ادیب، صحافی اور سیاست داں کی حد تک محدود نہ تھیں۔ ان سب پر حاوی ان کے ایک پُر اثر مقرر ہونے کی ان کی صلاحیت تھی۔ اردو زبان کی تاریخ ہی نہیں بلکہ وہ ہندوستان کی تاریخ سے بھی خوب واقف تھے۔ اردو نثر ہو کہ نظم اس کی ابتداء سے لے کر ہم عصر نثر نگاروں اور شاعروں کی تحریروں کا انہوں نے مطالعہ کیا تھا۔ شاعری میں تو انہیں ید طولی حاصل تھا۔ اساتذہ سے لے کر عصرِ حاضر کے نوجوان شاعروں کے اشعار انہیں یاد تھے۔ موضوع دے دیں اور ان سے فرمائش کریں کہ کوئی اچھا شعر اُس موضوع پر سنا دیں تو وہ ایک نہیں کئی شعر اس موضوع پر سنا دیتے۔ موضوع بدل دیجئے تب بھی انہیں اسی روانی سے دوسرے موضوع پر شعر پڑھتے ہوئے سن لیجئے۔ کیوں نہ ہو انہوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فارغ التحصیل کی اسناد حاصل کی تھیں۔ ابتداء میں ورنگل کالج اور بعد میں انوار العلوم کالج میں پڑھایا بھی۔ پہلی بار پبلک اسٹیج سے انہوں نے تقریر کی تھی تو ان کی نوبیاہتہ رفیق حیات ریاست خانم نے جو سامعین میں موجود تھیں ان سے کہا۔ ''الفاظ تو آپ کی محنت کی کمائی ہیں لیکن تقریر کرنا آپ کو ودیعت ہے۔'' تقریر کے درمیان وہ موزوں ومناسب شعر بھی سنایا کرتے تھے۔ چاہتے تو ایک ایک جملے کے بعد ایک ایک شعر سنا سکتے تھے۔ انہیں بولنے اور لکھنے دونوں پر عبور تھا۔ ایسی سلیس اور بلیغ نثر استعمال کرتے جیسے وہ شعر ہی سنا رہے ہوں۔

پہلی ملازمت اختر صاحب نے ورنگل کالج میں کی۔ یہیں سے ان کی ملازمتوں کی

ابتداء ہوئی۔ مرحوم سید عبد القدوس کہا کرتے کہ لوگ ملازمتوں کے پیچھے دوڑتے رہے لیکن ملازمتیں اختر صاحب کے پیچھے دوڑتی تھیں۔ ورنگل کالج میں پڑھا ہی رہے تھے کہ قاضی عبدالغفار نے روزنامہ پیام کی ادارت سنبھالنے کے لئے انہیں حیدرآباد مدعو کیا۔ پیام چھوٹا تو انوار العلوم کالج میں اردو کے لکچرار ہوئے۔ وہاں سے نکلے تو آندھرا پردیش ماہنامے کی ادارت سنبھالی۔ اس سے سبکدوش ہو کر بمبئی میں بلٹز کے ایڈیٹر بنے۔ آخر میں بمبئی سے لوٹ کر حیدرآباد اردو اکاڈمی کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہوئے۔ شاید ان کے سب سے کمزور ہونے کی صفت سیاست داں کی تھی ورنہ وہ اکاڈمی کے ڈائرکٹر ہوتے۔ اب اس کے بعد عمر کے آخری دور میں کہیں اور نہ جاسکتے تھے۔ آخری وقت تک اسی کے ہو رہے۔ اسرار الحق مجاز کے بارے میں جاں نثار اختر نے کہا تھا کہ انہوں نے کئی ملازمتیں کیں کوئی بھی ملازمت اس لئے راس نہ آئی کہ مجاز نے کسی جگہ کوئی مفاہمت نہیں کی۔ اختر صاحب کے معاملے میں سوائے پیام کی ایڈیٹری قبول کرنے اور اسے چھوڑنے کے ہم دوسری ملازمتوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ اردو اکاڈمی میں چندر سریواستو کے دور میں مفاہمت اس لئے کی کہ وہ اور کہیں جا نہیں سکتے تھے۔

شخصی طور پر اختر حسن صاحب سے میں سلیمان اریبؔ اور عالم خوندمیری صاحب کے توسط سے متعارف ہوا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اختر صاحب ماہنامہ آندھرا پردیش کے ایڈیٹر تھے۔ سن 1964 میں کانگریس پارٹی میں وزارت عظمٰی کے لئے اندرا گاندھی اور مرارجی دیسائی کو لے کر اختلاف ہوا۔ پارٹی کا اندرونی معاملہ تھا۔ فیصلہ کے اعلان کا وقت آیا تو کسی نے پوچھا۔ ''لڑکا یا لڑکی؟'' جواب ملا۔ ''لڑکی'' اس واقعہ کو لے کر اس دور کے سماجی اور سیاسی حالات پر میں نے ایک مضمون لکھا تو احباب نے مشورہ دیا کہ اسے آندھرا پردیش کے رسالے میں چھپنا چاہئے۔ میں مضمون لے کر اختر صاحب کے اجلاس پر گیا۔ انہوں نے مضمون کو ادھر ادھر سے دیکھا اور اپنے پاس رکھ لیا۔ میں نے سوال کیا کہ کیا یہ مضمون چھپے گا تو انہوں نے بڑی سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ نہ صرف چھپے گا بلکہ آپ کو اس کا معاوضہ

بھی ملے گا۔ مجھے دس بارہ سال کا پرانا واقعہ یاد آ گیا میں اپنا ایک ترجمہ لے کر ایک اخبار کے دفتر گیا۔ اخبار کے کرتا دھرتا نے مضمون لے کر رکھ لیا تو میں نے یہی سوال کیا تھا اور جواب ملا تھا۔ ''میاں چھپ جائے تو غنیمت جانو''

اختر حسن صاحب پر بعض احباب کو میں نے الزام دیتے ہوئے سنا کہ وہ روپوں پیسوں کے ساتھ بڑی بے راہ روی برتتے تھے۔ یہ بھی سنا کہ پیام کی ایڈیٹری کے زمانے میں اشتہارات کا پیسہ انہوں نے نظام کلب میں رمی کھیلنے میں گنوایا۔ یہی سبب تھا کہ اخبار بند ہو گیا۔ نہ میں اس کی تصدیق کر سکتا ہوں نہ میں نے کبھی یہ سوال ان سے پوچھنا ضروری سمجھا اس لئے کہ پیسے ہی کے معاملہ میں کیا میں نے انہیں کسی بھی سماجی مسئلہ میں ہمیشہ راست باز پایا۔ برس دو برس کی بات نہیں۔ کم از کم بیس پچیس برس تک میں ان سے قریب رہا۔ راست بازی یہاں تک کہ کسی کمزور لمحہ میں ایک دوست نے ایک خاتون کی برائی کی تو اختر صاحب نے اس کا ذکر خاتون سے کر دیا۔ غیبت ان کا مقصد نہیں تھا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ خاتون میں ایسی کوئی کوتاہی ہے تو وہ اسے دور کر لے۔

یہ تو ان کی سوانح کے چند سرسری واقعات رہے۔ میں انہیں اپنے ان سرپرستوں میں شمار کرتا ہوں جن سے میں نے علم و ادب میں اکتساب کیا۔ اختر صاحب کی صحبت میں جتنے فارسی اور اردو کے شعر میں نے سنے نہ صرف یہ کہ اتنے شعر اپنے کسی استاد یا شاعر دوست سے نہ سنے بلکہ یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ زندگی میں تمام احباب سے سنے ہوئے اشعار کی کل تعداد اتنی نہیں جتنی کہ اکیلے ایک اختر صاحب سے سننے میں آئی۔ انہوں نے اکثر یہ کہا کہ لڑکپن میں خاندان کے چھوٹے بڑے سب ہی مل کر وقفہ وقفہ سے کسی شام بیت بازی کی محفل جماتے۔ دو پارٹیاں بنائی جاتیں۔ اگر کسی پارٹی کے ایک فرد نے کوئی ایسا شعر سنایا ہو جو دوسری پارٹی کے کسی بھی فرد کو یاد ہے تو وہ شعر الخط کر دیا جاتا اور مخالف پارٹی والوں کو کوئی نیا شعر پیش کرنا ہوتا۔ یہ سلسلہ برسوں تک قائم رہا۔ اس کے بعد اختر صاحب کی طالب علمی اور اس کے بعد

کے دور نے اختر صاحب کا شعر و ادب سے ایسا ناطہ جوڑا کہ آخری وقت تک یہ ان کا اوڑھنا بچھونا رہے۔ ان کی بیماری کے ابتدائی دور ہی میں ہم لوگوں نے مغنی تبسم صاحب کے گھر پر آڈیو کیسٹ پر ان کی زندگی کے اہم واقعات کو ریکارڈ کرنے کا انتظام کیا۔ گیارہ یا بارہ بیٹھکیں ہوئیں۔ آخری دور کے چند واقعات رہ گئے تھے جو ریکارڈ کرنا باقی تھے کہ مغنی صاحب کے گھر ڈاکہ ہوا۔ سونا چاندی کچھ نہ ملا تو ڈاکوؤں نے کپڑوں اور کیسٹوں ہی کو غنیمت جانا۔ انہیں کیا خبر کہ ان کیسٹوں میں کوئی کیمیا گری ایسی نہیں کہ پیتل یا تانبے کو سونا بنا سکے۔ جو باتیں آدمی کو انسان بنانے کے لائق تھیں انہیں ڈاکوؤں نے چرایا تھا۔ کسی ڈاکو کو توفیق ہوئی اور اس نے ان کیسٹوں کو سنا تو اس کا بھلا ہی ہوا ہوگا۔ کسی ادیب کا اغوا کیا جا سکتا ہے۔ اسے محبوس رکھا جا سکتا ہے۔ اس کا قتل ہو سکتا ہے لیکن ادب تو وہ پودا ہے جس کا اگر پیڑ بھی کاٹا جائے تو اس کی جڑوں سے اور بھی کونپل پھوٹتے ہیں اور ادب کی جڑیں تو کبھی نابود ہونے والی نہیں۔ اس سرقہ کی پابجائی اختر صاحب کی بہنوں باجی جمال النساء بیگم اور ڈاکٹر رضیہ اکبر کی معاونت سے ہوئی۔ اختر صاحب کی سوانح حیدرآباد کے ماہنامہ سب رس میں قسط وار چھپی۔

اختر حسن صاحب کے ساتھ کسی بھی طرح کی کوئی نشست ہوتی وہ شعر و شاعری کی محفل میں تبدیل ہو جاتی۔ اس محفل میں عام طور پر مغنی تبسم صاحب سید سراج الدین صاحب اور آنرک سیکوئیرا صاحب ہوا کرتے۔ عالم خوندمیری صاحب کی بے وقت موت نے انہیں ہم سے جدا کر دیا ورنہ وہ بھی اکثر شریک رہا کرتے۔ ان احباب کے علاوہ بی نرسنگ راؤ' سید عبدالقدوس' بھاسکر شیوالکر اور کبھی کبھی خالد قادری اور مصحف اقبال توصیفی بھی شامل رہتے۔ جب کبھی وحید اختر یا نثار احمد فاروقی صاحبان حیدرآباد آتے تو ان حضرات کی موجودگی محفل کی رونق کو اور بھی دوبالا کر دیتی۔ سراج صاحب کوئی شعر سنا رہے ہیں تو اس کا متبادل شعر نثار احمد فاروقی صاحب پیش کر رہے ہیں۔ اسی موضوع پر شعر سنا کر اختر صاحب اپنی یاد کو تازہ کرتے۔ کیا اردو کیا فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی ہوتی۔

جن احباب کو اختر حسن صاحب کی نجی محفلیں نصیب ہوئیں وہ جانتے ہیں کہ بات کسی موضوع پر ہوتی اختر صاحب اس موضوع پر کوئی نہ کوئی شعر سنا دیتے۔ کیا میرؔ، کیا غالبؔ، کیا اقبالؔ، ، خیامؔ، سعدیؔ، رومیؔ، حافظؔ، نظیریؔ، عرفیؔ، بیدلؔ، سارے اساتذہ کا بیشتر کلام ان کی نوک زبان پر ہوتا۔ اپنے دور کے شاعروں کے کلام سے بھی وہ غافل نہ تھے۔ فراقؔ، ہو کہ جوشؔ، فیضؔ، مخدومؔ، شاذؔ تمکنت ہو کہ ساحرؔ لدھیانوی ان سب کو موقع اور ضرورت کے لحاظ سے پیش کر دیتے۔ آپ نے کمپیوٹر پر انگلی رکھ دی اور مطلب کا شعر ان کی زبان سے نکلا۔ کبھی کبھی مجھے موقع ملتا تو میں ان اشعار کو کاغذ کے پرزوں پر نوٹ کر لیتا اور گھر پہنچ کر انہیں اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیتا۔ ایسے ہی چند واقعات کا ذکر کرتے ہوئے میں اپنے قارئین کو ان محفلوں میں لے چلتا ہوں جو اختر حسن صاحب کی معیت میں گزریں۔

۲۳ مئی ۱۹۸۳ء کی بات ہے۔ اُن دنوں اختر حسن صاحب اے پی اردو اکاڈمی میں اسسٹنٹ سکریٹری تھے۔ وہ اپنے اجلاس میں کرسی پر بیٹھے ہیں۔ سامنے احمد جلیس اور میں بیٹھے ہیں۔ اتنے میں حسن فرخ آئے اور جلیس سے مخاطب ہو کر کہا، آپ یہاں کب سے بیٹھے ہیں، معاً اختر صاحب نے شعر پڑھا۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

۸ر فروری ۱۹۸۴ء کا دن، اُس شب رویندر بھارتی میں ڈرامہ "سفید کنڈلی" ہونے والا ہے۔ میں نے دو ٹکٹ خریدے۔ جوں ہی میں نے ایک ٹکٹ اختر صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا انہوں نے جیب سے پیسے نکالے۔ میں نے کہا ایسی بھی کیا جلدی۔ جواب شعر پڑھ کر دیا۔

نہ قرارداد کیف آزادگاں نہ گرد مال
چوں صبر در دلِ عاشق جو آب در غربال

(جس طرح عاشق کا دل صبر نہیں کر سکتا اور چھلنی (غربال) میں پانی نہیں ٹھہرتا، اسی طرح ایک آزاد

منش کے پاس مال نہیں ٹکتا)

اُن ہی دنوں پروفیسر رضیہ اکبر کے پاس ایک شام چند احباب بیٹھے تھے۔ جن میں عزیز آرٹسٹ، سید عبدالقدوس، میں اور اختر حسن صاحب موجود تھے۔ عزیز پر کبھی کبھی شاعری کی دھن سوار ہو جاتی تھی۔ اُس دن انہوں نے میرؔ کے چند شعر سنائے۔ اب کیا تھا اختر صاحب نے جیسے میرؔ کا دیوان کھول کر رکھ دیا۔ تین شعر جو میں نے نوٹ کئے وہ یہ تھے۔

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
کریں ہیں دعویٰ خود چشمی آہوانِ دشت
ٹک ایک دیکھنے چل کارواں گنواروں کا
پھر نہ دیکھا کچھ بجز ایک شعلۂ پر پیچ وتاب
شمع تک اتنا تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

ابھی اختر صاحب شعر سنا ہی رہے تھے کہ عزیز نے کہا اس طرح کی محفلیں مستقل ہوتی رہنی چاہئیں۔ اس پر اختر صاحب نے غالبؔ کا یہ شعر پڑھا۔

مستقل مرکز غم پر بھی نہیں ہیں ورنہ
ہم کو اندازہ آئین وفا ہو جاتا

یاد نہیں رہا وہ کونسی محفل تھی لیکن، آئینہ کا موضوع آیا اور کسی صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ　　کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

اس پر اختر صاحب نے پہلے اقبالؔ کا شعر پڑھا۔

حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینہ کے گھر میں اور کیا ہے

پھر دوسرا شعر غالبؔ کا پڑھا۔

تماشہ کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

''تماشہ'' کے لفظ پر غالبؔ ہی کا ایک اور شعر انہوں نے پڑھا۔

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشہ ہو
کہ چشمِ شوق شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

آئینہ کے موضوع پر ایک دوسرا واقعہ میری ڈائری میں درج ہے۔ تاریخ نہیں لکھی۔ اردو اکاڈمی میں اختر صاحب جہاں بیٹھتے تھے پہلو میں ایک اور کمرہ تھا، جس میں رشید قریشی بیٹھا کرتے تھے۔ دونوں کے درمیان دیوار کی جگہ ایک بڑا شیشہ تھا۔ دونوں کمروں میں بیٹھے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو صاف نظر آتے۔ چند احباب اختر صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ محمود سلیم کو ان دونوں حضرات سے دستخط لینی تی۔ وہ پہلے قریشی صاحب کے دستخط لے آئے اور اختر صاحب کے دستخط لیتے ہوئے یوں ہی کہدیا۔ ''بیچ میں ایک آئینہ ہی تو ہے''۔ اختر صاحب نے فوراً یہ شعر پڑھا۔

رشکِ آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو
صاف ادھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

ایک دن اختر صاحب، عزیزؔ قیسی اور میں صفیہ اریبؔ کے گھر پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ راشد آذر آ گئے۔ شعر و ادب پر تو باتیں ہوتی رہیں۔ بات مغلیہ دور کے زوال تک پہنچی۔ عزیز قیسیؔ نے تاریخی واقعات ذرا تفصیل سے سنائے۔ اختر صاحب نے آصف جاہ اول کا وہ واقعہ سنایا کہ کس طرح انہوں نے نادر شاہ کو ایک شعر سنا کر دلیؔ میں قتل عام کو رکوایا تھا۔ واقعہ یوں تھا کہ نادر شاہ کے ایک فوجی کو کسی ہندوستانی نے قتل کیا تو نادر شاہ اپنی تلوار نیام سے نکال کر مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا کہ جب تک وہ اپنی تلوار نیام میں واپس نہیں رکھ دے گا قتل عام جاری رہے گا۔ آصفجاہ نے اس کے حضور میں پہنچ کر یہ شعر پڑھا۔

کسے نماندکہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

(اب کوئی زندہ نہیں بچا ہے کہ تو اپنی تیغ ناز سے اسے قتل کرے۔ ایک صورت یہی ہے کہ مردہ خلق کو زندہ کر کے پھر سے مارا جائے)

کہتے ہیں اس شعر کو سن کر نادر شاہ نے اپنی تلوار نیام میں رکھ لی۔

اختر صاحب نے یہ شعر سنا کر ہم لوگوں کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں کے لئے ہم سب خاموش تھے۔ پھر اسی کے توڑ کا ایک شعر میرؔ کا کہا ہوا سنایا۔

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میرؔ زبس
ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

میرؔ کے اس شعر پر عزیزؔ قیسی نے مُلا محتشم کا ایک شعر سنایا۔ شعر فارسی میں تھا۔ مفہوم، ہر فرعون را موسیٰ کے ہم معنی تھا۔ اُس موضوع پر اختر صاحب نے اردو کا ایک سلیس شعر سنایا۔

پہلے بھی جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اس کو بھی خدا ہونے کا اتنا ہی یقیں تھا

باتیں ہو رہی تھیں۔ عزیز قیسیؔ کو یاد آیا کہ انہیں کہیں اور وقت پر پہنچنا ہے۔ انہوں نے اجازتِ چاہی اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا ''جاؤں کہ ٹھہروں''؟ قیسیؔ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہی تھے کہ اختر صاحب نے مومن کا یہ شعر پڑھا۔

ٹھہرو کوئی دم کہ جان ٹھہرے
مت جاؤ کہ جی سے جائیں گے ہم

۴؍اپریل ۱۹۸۴ء کی شام تھی شاذؔ تمکنت اور اختر صاحب میرے گھر پر بیٹھے ہیں، تھوڑی دیر بعد ہم لوگوں کو اقبال اکاڈیمی کے مشاعرہ میں جانا تھا۔ شاذؔ تمکنت نے غالبؔ کی ایک غزل پر تضمین باندھی۔ شاذؔ نے غالبؔ کا مصرعہ سنانے کیلئے لب کھولے ہی تھے کہ اختر صاحب نے پورا

شعر پڑھ دیا۔ اس شعر کو تو میں نوٹ نہ کر سکا لیکن ہم لوگ مشاعرہ میں جانے کے لئے اٹھ رہے تھے
کہ شاذؔ نے ایک شعر پڑھا۔

آجاؤ کہ اب خلوتِ غم خلوتِ غم ہے
اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے (جگر)

اختر صاحب کہاں رکتے، دل کی کیفیت پر میرؔ کا یہ موثر شعر سنایا۔

شہرِ دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں
آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا

یکم ستمبر ۱۹۸۴ء کا واقعہ ہے۔ اس شام بسنت ٹاکیز میں این ٹی راما راؤ وزارت کی برطرفی
کے خلاف پالکی والا، ارون شوری اور جسٹس تارکنڈے تقریر کرنے والے تھے۔ واپسی پر ہم لوگ
مغنی صاحب کے گھر گئے۔ سیاست دانوں کے رویوں پر بات ہونے لگی۔ اپنے مفاد کی خاطر
پارٹیاں بدلنے والوں کی بات آئی۔ اختر صاحب نے شعر پڑھا۔

مومن ز دیں برآمدہ صوفی ز اعتقاد
ترسا محمدی شد و عاشق ہماں کہ ہست

(مومن اپنے دین سے نکل آیا، صوفی اپنے اعتقاد سے انحراف کر گیا، زرتشت نے اسلام اختیار کیا
لیکن صرف عاشق ہی ایسا ہے کہ وہ اپنے مسلک پر قائم ہے)

اب اختر صاحب کے حافظہ سے نکلے ہوئے چند ایسے اشعار بھی سن لیں جنھیں انہوں
نے موضوع کے حوالے سے سنا دیا۔ واقعہ یا تاریخ میری ڈائری میں درج نہیں ہے۔

کسی نے گل کی بات کی اور اختر صاحب نے پہلے ایک مصرعہ حافظؔ کا سنایا ؏

اے گل زتو خورسندم تو بوئے کسے داری

(اے گل میں تجھ سے خوش ہوں، تو کس شخص (محبوب) کی خوشبو رکھتا ہے)

پھر ایک اور شعر پڑھ دیا۔

زرفتن چمنت بر بہار منت ہاست
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

(تیرے چمن میں جانے سے بہار پر ہزاروں احسانات ہوئے۔ یہ گل تیرے ہاتھ میں آکر شاخ
سے کہیں زیادہ تروتازہ ہوجاتا ہے)

چائے دم دینے کی بات آئی تو یہ شعر سنا دیا۔

یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا
تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا

آپ نے خونِ جگر کی بات کی اور اختر صاحب کی زبان سے نکلا۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

ایک دن اختر صاحب پر شاعری کا موڈ سوار تھا۔ شعر پر شعر سنائے جا رہے تھے۔ پہلے تو
جواہر خسروی کی پہیلیاں سنائیں۔ حاضر جوابی کی بات آئی تو انہوں نے بہت سارے ایسے شعر
سنائے جن میں سوالات بھی تھے اور جوابات بھی۔ میرے بس میں نہیں تھا کہ ان تمام اشعار کو نوٹ
کرتا۔ ابھی باتیں ختم ہی نہیں ہوئی تھیں کہ چینیوں کی سرکس اور ان کی کرتب بازی کا ذکر ہوا تو کہنے
لگے ''ارے جناب آپ نے اردو شاعری کی کرتب بازی نہیں دیکھی، لیجئے یہ چند شعر سن لیجئے۔

محفل میں کر رہے تھے وہ اغیار کو سلام
وعلیکم السلام کئے جا رہا تھا میں
اک تری ترچھی نظر سے کیا سے یہ کیا ہوگیا
دل کے ٹکڑے ہوگئے ایضاً کلیجہ ہوگیا
پہلے اس نے مُس کہا پھر تَق کہا پھر بِل کہا
اس طرح ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کر دیئے

ایک اور محفل میں مغنی صاحب کے گھر پر سراج الدین صاحب اور اختر صاحب بھی موجود تھے۔ گویا صرف ہم چار ہیں۔ اختر صاحب نے اردو کے بہتیرے شعر سنائے۔ فارسی کی چند غزلیں بھی سنائیں میری خواہش پر انہوں نے عثمانؔ ہارونی کی اور حافظؔ کی ایک ایک غزل بھی لکھ کر دی۔ عثمانؔ ہارونی کی غزل کا ایک بہت ہی مقبول شعر ہے۔

تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خونِ من ریزی
من آں بسمل کہ زیرِ خنجر خونخوار می رقصم

(تو وہ قاتل ہے محض تماشہ کے لیے میرا خون بہا رہا ہے
اور میں وہ زخمی ہوں جو زیر خنجر خونخوار رقص کر رہا ہوں)

حافظؔ کی غزل بھی کافی مشہور ہے۔ قارئین نے کسی نہ کسی محفل میں سنی ہوگی۔ چند شعر پیش ہیں۔

تعال اللہ چہ دولت دارم امشب
کہ آمد ناگہاں دل دارم امشب
چو دیدم روئے خوش من سجدہ کردم
بحمداللہ نکو کردارم امشب
تو صاحب نعمتی من مستحقم
زکوٰۃ حسن دہ حق دارم امشب

(۱) اللہ تعالیٰ تیرا شکر ہے کہ میں نے آج رات کیا دولت پائی کہ ناگہاں آج رات میرا محبوب آ گیا
(۲) جب میں نے اس کا خوبصورت چہرہ دیکھا میں سجدہ میں گر گیا، بحمداللہ میں بڑا نیک کردار ثابت ہوا
(۳) تو صاحب نعمت ہے میں مستحق ہوں، حُسن کی زکوٰۃ دے کہ میں حق دار ہوں

اختر حسن صاحب کی علالت کا سلسلہ ۱۹۸۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ کہنے کو تو ہم کہہ لیتے

ہیں کہ وہ منحوس گھڑی تھی۔ جو کچھ بھی ہو وہ اپنے دفتر سے آٹو رکشا میں گھر واپس لوٹ رہے تھے کہ ناگہاں آٹو رکشا الٹ گئی۔ اختر صاحب کے ہاتھوں اور پاؤں کی ہڈیوں میں فریکچر آئے جوں ہی اطلاع ملی میں انہیں ڈاکٹر خواجہ الیاس عسکری کے دواخانہ لے گیا۔ کار سے معائنہ کی میز تک انہیں اسٹریچر میں لے جایا گیا۔ ٹیبل پر لٹایا ہی گیا تھا کہ انہوں نے شعر سنانے لگے، پہلے مولانا رومؔ کا یہ شعر سنایا۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہرجا کہ خاطر خواہ اوست

(میرے دوست نے گلے میں رسی ڈال دی ہے، اس کے ہاتھ میں اس کا ایک سرا ہے، وہ جس طرح چاہے کھینچ لے جائے)

اب اختر صاحب کے جسم کی حرارت بڑھنے لگی تھی۔ درد کی شدت میں اضافہ ہوا۔ پہلے ڈاکٹر صاحب کے مددگار آئے اور ایک پہلو لٹا کر پوچھا "کہاں کہاں چوٹیں آئی ہیں"۔ اختر صاحب نے شعر پڑھا۔

ٹھہر تو جاؤ نکیرین ابھی دیتا ہوں جواب
تازہ وارد ہوں نیا گھر ہے پریشانی ہے

چند منٹ بعد ڈاکٹر عسکری آئے اور معائنہ کرتے ہوئے کہا کہ اختر صاحب ذرا اپنی گردن پلٹائیں۔ اس پر جس برجستگی سے اختر صاحب نے شعر پڑھا خود ڈاکٹر صاحب حیران رہ گئے۔

وہ آئے ہیں تو عرض سوزشِ دردِ دروں کرلوں
قضا اتنی تو مہلت دے کہ گردن یوں سے یوں کرلوں

اختر صاحب چند ماہ میں چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے۔ اردو اکاڈمی کی ملازمت کا سلسلہ پھر چل پڑا۔ ۱۸ر ستمبر ۱۹۸۸ء کے دن وہ ایک ادبی جلسہ میں تقریر کر رہے تھے کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ تقریر کرتے ہوئے وہ گر پڑے۔ سٹی نرسنگ ہوم میں شریک ہوئے۔ افاقہ پا کر گھر منتقل ہوئے تو چند احباب عیادت کے لیے پہنچے۔ ریاست خانم نے اختر صاحب سے کہا "دیکھئے آپ کے

احباب عیادت کے لیے آئے ہیں۔ اختر صاحب نے نیم وا آنکھوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے غالبؔ کا یہ شعر پڑھا۔

خوشا اقبال رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمع بالیں طالع بیدار بستر ہے

ابھی میں دوسرے مصرعہ پر غور ہی کر رہا تھا کہ انہوں نے غالبؔ ہی کا ایک اور شعر پڑھا۔

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیر رسوائی
عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

ایک نہ شد دوشد والی بات ہوگئی۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انہوں نے وضاحت کی ”دیکھئے کہ ایسی بے باکی اور چالاکی کسی اور شاعر میں نہیں۔ کہتا ہے کہ میرے محبوب نے میرے ساتھ جو بے وفائی کی اس کا یہ سلسلہ عدم تک زنجیر کی طرح ہے۔ (پیغارہ جو یعنی لڑائی جھگڑا کرنے والا)

آٹھ دس مہینوں میں اختر صاحب اس قابل ہوگئے کہ دوستوں کی محفلوں میں شامل ہوسکیں۔

24 جون 1989ء اختر صاحب کی سالگرہ کا دن تھا۔ نظام کلب میں سالگرہ منائی گئی۔ ڈنر سے قبل وہ ایک بھر پور شعری نشست تھی۔ میری جیسے عید ہوگئی۔ شعر گوئی کا تسلسل اولے برسنے جیسا تھا۔ کبھی دائیں کبھی بائیں پہلو بدلتے رہئے اور سامنے بھی توجہ قائم رکھیے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن قلم ساتھ نہ دے سکا۔ چند شعر لکھ پایا۔ مغنی صاحب نے فیضؔ کا شعر سنایا۔

آس اس در سے ٹوٹتی ہی نہیں
جا کے دیکھا نہ جا کے دیکھ لیا

اختر صاحب نے داغؔ کا شعر پڑھا۔

اس کے گھر داغؔ جا کے دیکھ لیا
دل کے کہنے میں آکے دیکھ لیا

موضوع بدلا تو سراج صاحب نے بیدلؔ کا یہ شعر سنایا۔

از بیابانِ عدم تا سرِ بازارِ وجود
بہ تلاشِ کفنے آمدہ عریانے چند

(چند عریاں لوگ بیابانِ عدم سے نکل کر بازارِ وجود میں کفن کی تلاش میں آئے ہیں)

اس پر مغنی صاحب نے فانیؔ کو پیش کیا۔

کیفیتِ ظہور فنا کے سوا نہیں
ہستی کی اصطلاح میں دنیا کہیں جسے

ہستی کے تصور کے ساتھ اختر صاحب کی حسِ شعریت پھڑک اٹھی۔ انہوں نے یگانہؔ کا شعر پڑھا۔

کار گاہِ ہستی کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

سراج صاحب کہاں چپ بیٹھ سکتے تھے۔ انہوں نے غالبؔ کا شعر پڑھا۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

(آؤ کہ آسماں کے قواعد بدل دیں اور موت کو شراب کے پیالے کی گردش سے لوٹا دیں)

(رطلِ گراں = بھاری پیالہ)

اختر صاحب نے رومیؔ کو بیچ میں لاتے ہوئے کہا کہ غالبؔ کا یہ شعر رومیؔ کے بارے میں سنیں۔

عمرہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بو سعید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

(عمریں چاہئیں تب ایک مردِ حق پیدا ہوگا جیسے ابو سعید خراساں میں اور قرن میں اویس)

کئی حسین شاموں میں نظام کلب کی وہ شام بھی ایک بے حد حسین شام تھی ایسے ایسے اشعار سنے جو پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔

ہماری محفلوں میں کبھی کبھی ستار صدیقی صاحب بھی شریک رہتے ۔ قرآن کے حوالے سے وہ ہمیشہ کہتے کہ کوئی بات دلیل کے بغیر نہیں ہوسکتی ۔ ایسے ہی ایک موقع پر اختر صاحب نے جو شعر سنایا وہ مجھے یاد رہ گیا' شاعر کا نام یاد نہیں ۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

(استدلال کے پاؤں لکڑی کے ہوتے ہیں مضبوط تو ہوتے ہیں لیکن تمکنت نہیں ہوتی)

ایک دوسرا واقعہ بھی بہت پرانا ہے ۔ مخدوم ایوارڈ حاصل کرنے کے لئے قرۃ العین حیدر شہر آئی ہوئی تھیں ۔ حلف نے ان کے لئے ایک تہنیتی جلسہ کا اہتمام کیا ۔ اس ایوارڈ اور مالی امداد کے لئے اختر صاحب نے قرۃ العین حیدر کا نام اردو اکاڈمی کو پیش کیا تھا ۔ اختر صاحب سے ان کے دیرینہ خاندانی مراسم تھے ۔ تہنیتی جلسہ کے دوسرے دن سراج صاحب اور میں اختر صاحب کے گھر گئے ۔ قرۃ العین کے ادبی کارناموں پر دیر تک باتیں ہوتی رہیں ۔ ایک موقع پر اختر صاحب نے یہ شعر پڑھا ۔

سراپا وہ جس جا نظر کیجئے
وہیں عمر اپنی بسر کیجئے

اس پر سراج صاحب نے جو شعر سنایا وہ بھی معرکہ کا شعر ہے ۔

ہزار رنگ دریں کارخانہ درکار است
مگیر نکتہ نظیریؔ ہمہ نکو بستند

(اے نظیری نکتہ چینی مت کر اس کارخانے میں ہزار رنگ درکار ہیں)

واپسی کا وقت ہوا اور ہم لوگوں نے اختر صاحب کو خدا حافظ کہنا چاہا انہوں نے حافظ کے یہ دو شعر پڑھے ۔

بلبلے برگِ گل خوش رنگ در منقار است
اندراں برگ ونوا صد نالہ ہائے زار است

(بہ ظاہر بلبل اپنی چونچ میں خوش رنگ برگ گل لیے ہوئے ہے
لیکن اس ساز وسامان میں بے شمار نالہ وزاری ہے)

گفتمش درعینِ وصل ایں نالہ و فریاد چیست
گفت مارا جلوۂ معشوق در ایں کار است

(میں نے اس سے کہا کہ عین وصل کی حالت میں یہ
نالہ وفریاد کیوں؟
اس نے کہا کہ مجھے معشوق کا جلوہ درکار ہے)

اکتوبر 1990ء کا ایک دن تھا ۔ اختر صاحب کو فون کیا تو پتا چلا کہ مسز اختر بمبئی گئی ہوئی ہیں ۔ اختر صاحب گھر پر تنہا ہیں ۔ میں نے کہا ضرورت ہو تو میں پہنچ جاؤں ۔ اختر صاحب احسان لینے سے گریز کرتے تھے ۔ جواب دیا ۔ کیوں اتنی دور سے یہاں آنے کی تکلیف کرتے ہو ۔ اس کے بعد فون ہی پر غالب کا ایک شعر سنا دیا ۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اختر صاحب صرف اساتذہ کے اشعار ہی نہیں بلکہ ترقی پسند اور جدید رجحان کے شاعروں کو بھی سنا دیتے ۔ اچنبھا ہوتا ہے کہ اختر صاحب کی ذات میں روایتی شائستگی اور اخلاقی معیارات کے ساتھ ایک رومانٹک شخصیت بھی پوشیدہ تھی ۔ جہاں وہ ثقہ شعر سناتے وہیں کبھی کبھی شوخ اشعار بھی سنا دیتے اور سننے والے کو حیرت میں ڈال دیتے ۔ پہلے دو ایسے شعر سن لیں جو فلسفیانہ فکر سے لیس ہیں ۔

به زیر کنگرهٔ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

(اس کے کبریا (ذات واجب) کے کنگرہ کے نیچے ایسے ایسے مردانِ حق ہیں کہ جن کے دام میں فرشتے ہیں جو پیمبر کا شکار کرتے ہیں اور یزداں کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں)

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

(دانش مندی کی ڈینگیں غلط ہم کو عبادت کا نفع بھی معلوم ہے دُرد جسے کہتے ہیں وہ غفلت کا ساگر ہے چاہے وہ دنیا ہو کہ دین)

اب وہ شوخ اشعار بھی سن لیں جنہیں میں نے پہلے کبھی سنا نہیں تھا۔ بعد میں بھی کسی اور سے نہیں سنا۔

کسی کے آنے سے ساقی کے ایسے ہوش اڑے
شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشے میں

ہوش اڑ جانے پر کسی سے بھی ایسی حرکت سرزد ہو سکتی ہے لیکن ذیل کے شعر میں صرف وقتِ صبح کو شاعر نے کیوں مخصوص کیا۔ شاید ضرورت لفظی ہوگی یہی میری سمجھ میں آتا ہے۔

آستیں کہنی تلک اس نے چڑھائی وقتِ صبح
آ رہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

اوپر دیئے گئے اشعار کن شاعروں نے کہے ان کے نام تو یاد نہیں البتہ میرؔ کا ایک شعر جس میں شاعر نے اینڈ نے کے لفظ کو بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے اختر صاحب اکثر سنایا کرتے تھے اور کہتے کہ کسی اور شاعر نے میرؔ سے پہلے یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔

اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے بیچ
کھاؤ کسی کا تیر کسی کا شکار ہو

اختر صاحب سے سنا ہوا ایک اور شعر پیش کرتا ہوں۔ سن کر حیرت ہوئی تھی اور آج بھی جب کبھی یہ شعر یاد آ جاتا ہے اسی کیفیت سے دوچار ہوتا ہوں۔

نبردِ عشق میں پہلے ہوئے ہیں پاؤں ہی زخمی
نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے

سن 1991ء اگست و ستمبر کے مہینے تھے۔ کوئی دیواکر نامی صاحب امریکہ سے آئے۔ وہ شعیب اللہ پر ایک ڈاکیومنٹری بنانا چاہتے تھے۔ ان کا انٹرویو مغنی صاحب اور نرسنگ راؤ صاحب سے ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں اختر حسن صاحب پیام کے ایڈیٹر تھے جو ایک نیشنلسٹ اخبار تھا۔

دیواکر انٹرویو کے لئے اختر صاحب کے پاس پہنچے۔ وقت پہلے سے طئے تھا۔ میرے علاوہ مغنی صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ علالت کے سبب اختر صاحب کمزور دکھائی دیتے تھے۔ انٹرویو کے درمیان رکتے ہوئے انہوں نے کہا ''ایک وقت ایسا آتا ہے کہ دل و دماغ دونوں تھک جاتے ہیں۔ پاس ہی میں ریاست خانم صاحبہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے حامی بھری۔ ''جیسے اس وقت اختر صاحب کا حال ہے''۔ اختر صاحب نے فوراً سعدیؔ کا یہ شعر پڑھا۔

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

(دریا کے اس بہاؤ میں ہزاروں کشتیاں ایسی غرق ہوئیں کہ ایک بھی تختہ کنارے پر نظر نہیں آتا)

5 دسمبر 1991ء سے اختر صاحب کی حالت اور بھی بگڑنے لگی تھی۔ اکثر میرے ساتھ سراج صاحب بھی چلنا پسند کرتے۔ صحت کی خرابی کے باوجود اس دن اختر صاحب نے امیر خسروؔ کا بہت سارا کلام سنایا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کرتا کہ میری خواہش پر وہ خیامؔ کی رباعیاں کسی کاغذ پر لکھ کر دیتے۔ اس دن خسروؔ کے بہت سارے شعر ایسے سنائے جو ان سے بھی پہلے

کبھی نہیں سنے تھے۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا تو اختر صاحب نے جوشؔ کا یہ شعر پڑھا جسے میں نے لکھ لیا۔

جب علم کے سب کھنگال ڈالے قلزم
تب دولتِ عرفانِ جہالت پائی

اختر صاحب کی حالت روز بروز بگڑتی جارہی تھی۔ ان دنوں پاکستان سے ان کے برادر نسبتی خورشید علی خان صاحب آئے ہوئے تھے۔ فیملی بھی ساتھ تھی۔ اختر صاحب کے ساتھ چند دن گزار کر جب وہ واپس ہوگئے تو اختر صاحب اور بھی بجھ گئے۔ ایک دن فرمائش کی کہ میں کسی طرح ڈاکٹر خواجہ الیاس عسکری اور ڈاکٹر محمد اعظم کو لے آؤں۔ دونوں بھی ان ڈاکٹروں میں سے تھے جو مریضوں کے گھر پر نہیں جاتے۔ میرے کہنے سے زیادہ انہیں اختر صاحب کی دلداری منظور تھی۔ دونوں کو باری باری سے اختر صاحب کے گھر لے گیا۔ 19 اپریل 1992ء ڈاکٹر اعظم آئے تو ان سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب اب کوئی ایسا نسخہ تجویز کیجئے کہ جلد موت واقع ہو۔ ہم تمام دوست احباب اختر صاحب کی صحت سے مایوس ہو چکے تھے۔ صرف ایک ریاست خانم تھیں کہ کسی نہ کسی حکیم یا معالج سے علاج کرواتیں اور ان کی خدمت میں لگی رہتیں۔ ہمیشہ امید ظاہر کرتیں کہ افاقہ ہوجائے گا۔ چند دنوں کے بعد اختر صاحب کا ذہنی توازن بگڑنے لگا۔ وہ شخص جس نے موت کی خواہش کی تھی اب زندگی مانگ رہا تھا۔ ''ریاست مجھے کسی طرح بچالو''۔ ان کی اس دماغی کیفیت کے باوجود آخری دم تک شعر گوئی ان سے نہ چھوٹی۔ چیکوسلواکیہ کے سیاسی حالات بگڑ گئے اور آناً فاناً حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تو اختر صاحب کی زبان پر فوراً یہ شعر آ گیا۔

بہ یک لحظہ، بہ یک ساعت، بہ یک شام
دگرگوں می شود احوالِ عالم

(ہر لحظہ، ہر ساعت اور ہر شام احوالِ عالم بگڑتا رہتا ہے)

اختر صاحب کی زبان سے سنا ہوا یہ آخری شعر تھا جسے میں نے اپنی 22 جون 1992ء کی ڈائری میں درج کیا۔ علم وادب کی وہ شمع جو اپنے ماحول کو نصف صدی سے زیادہ روشن کئے ہوئے تھی۔ 18 ستمبر 1995ء کے دن شام کے 7 بجے ہوا کے ایک آخری جھونکے سے ہمیشہ کے لئے گُل ہوگئی۔ اس کے چار سال بعد تک ریاست خانم گھل گھل کر جیتی رہیں۔ ایک دن وہ بھی رحلت کر گئیں اور اسی قبرستان کی مٹی میں مل گئیں جہاں اختر صاحب اپنی آخری نیند سو رہے ہیں۔

ستمبر ۲۰۰۸ء

◆❖◆

نوٹ: جن اشعار کا حوالہ اس مضمون میں دیا گیا ھے انھیں میں نے اختر حسن صاحب سے زبانی سن کر لکھ لیا تھا۔ غلطیوں کے اندیشے کے پیش نظر چند احباب سے رجوع کیا۔ بعض نے انھیں درست کیا اور بعض سے ٹیلیفون پر بات ہوئی۔ میں ان احباب کا ممنون ھوں جنھوں نے مشورہ دیا تاھم اگر ان اشعار میں کھیں غلطیاں رہ گئیں ھیں تو اس کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ھے۔ (ق۔ز)

اندرناتھ چودھری

(وسیلۂ ظفر)

''سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے'' یہ کہاوت ہم نے اپنے بچپن میں سنی تھی۔ اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا کیوں کہ پورا لڑکپن بیل بنڈی میں اور گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کرتے گذرا۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں۔ ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ وہی عزیز واقارب ہوتے جن کے ساتھ زندگی گذرتی رہتی۔ ذرا بڑے ہوئے تو کبھی کبھی بس کے سفر کا موقع ملا۔ ادھیڑ عمر کو پہنچ کر ہوائی جہاز کا سفر نصیب ہوا۔ نصیب کہنا شاید مناسب نہ ہوگا کہ یہ میرے دل کی بات نہیں ہے۔ ایک سے زائد بار ہوائی جہاز میں بیٹھے تو پھر بیل بنڈیاں ہی یاد آئیں۔ جہاں چاہا رک گئے۔ ہری ہری گھاس نظر آئی تو بیلوں کو چرالیا۔ بھوک لگی تو کسی ندی کنارے توشہ کھول لیا۔ جب تک چاہا ستالیے اور جب چاہا سفر پر روانہ ہوگئے۔

توشہ کھولنے کا مزہ تو پہلی بار حیدرآباد تا دلّی کے سفر میں آیا تھا۔ ریل کا ایک سفر بچپن میں کیا تھا۔ اورنگ آباد ایلورہ کے غار دیکھنے طلبہ کو تعلیمی تفریح کے سفر پر لے جایا گیا تھا۔ میں اس وقت تیسری جماعت میں تھا۔ بالغ ہونے پر ریل کے چند اور سفر کیے۔ یاد نہیں آتا کہ ان دنوں ہم دلی کیوں جارہے تھے۔ صرف اتنا یاد ہے کہ سن 1981ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ساتھ

سفر کرنے والوں کا کوئی مشترک ایجنڈہ نہیں تھا۔ میں خوش تھا کہ عالموں اور آرٹسٹوں کے جھرمٹ میں سفر کررہا ہوں۔ اختر حسن صاحب، عالم خوندمیری صاحب، مغنی تبسم صاحب، عزیز آرٹسٹ۔ ٹرین ہمکنڈہ سے آگے بڑھ گئی اور سورج سوانیزہ اونچا ہوگیا تو ہم لوگوں نے ناشتہ کیا۔ اس کے بعد باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

آواز دوسرے مسافروں کے کانوں میں پڑی تو کہیں سے اچانک قادر علی بیگ نمودار ہوئے۔ حیدرآباد کا کون شاعر و ادیب یا ڈرامہ کا فن کار انہیں نہیں جانتا۔ ان کی سیٹ ذرا فاصلے پر تھی۔ ہم لوگوں میں سے کسی کی نظر ان پر نہیں پڑی تھی۔ انہوں نے ہی بتایا کہ دیر سے وہ ہم لوگوں کو تاک رہے تھے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا جیسے پھولوں کے گلدستہ میں ایک اور پھول کا اضافہ ہوگیا ہے۔ دریافت پر بتایا کہ وہ دلی میں اپنا ایک ڈرامہ پیش کرنے جارہے ہیں۔ ان کے اپنے تحریر کردہ ڈراموں کی کتاب ''ریشم کی ڈور'' ان کے ساتھ تھی۔ ہماری گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ پاس ہی کی سیٹ پر بیٹھے ایک صاحب دیر سے ہماری گفتگو سن رہے تھے۔ مداخلت اس لیے نہیں کی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ ڈرامہ کا موضوع زیر بحث آیا تو اجنبیت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہم لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ ''اعتراض نہ ہو تو کچھ ہم بھی سنیں آپ لوگوں کی باتیں''۔ جہاں اختر حسن صاحب جیسے اہل زبان ہوں وہاں اردو زبان کی مٹھاس اور شگفتگی کا کسی بھی انجانے شخص کو اپنی طرف کھینچ لانا کوئی عجوبہ نہ تھا۔ اب ہمارے پھولوں کے گلدستہ میں مزید ایک پھول جگہ پاچکا تھا۔

جس ٹرین میں ہم لوگ دلی کا سفر کررہے تھے وہ سرشام چنبل کی وادی تک پہنچ کر کسی ٹکنیکل خرابی کی وجہ سے رک گئی تو رات بھر رکی رہی۔ جو سفر ایک دن اور ایک رات کا تھا اب وہ ایک رات اور دو دن کا ہوگیا۔ مذہب، فلسفہ اور علم و ادب کے موضوعات نے وقت کو سکیڑ دیا۔ پھولوں کے گلدستہ کی مہک ماند پڑجاتی لیکن یہاں تو علم و ادب اور آرٹ کی مہک تھی۔ اس کی

کھڑکیاں کھلتی رہیں اور یہ مہک سارے کمپارٹمنٹ میں پھیل گئی۔ بیٹھنے کے لیے جگہ نہ ملی تو اہلِ ذوق مسافر کھڑے کھڑے سنتے رہے۔ وہ تھک کر اپنی سیٹوں پر چلے جاتے تو دوسرے ان کی جگہ لے لیتے۔ یہ کرامات تھیں اردو کے اشعار کی اور اختر حسن صاحب کے شعر سنانے کی۔

یہاں تو مجھے اندر ناتھ چودھری کی مختصر سوانح بیان کرنی ہے۔ لیجئے چند باتیں گوش گذار کرتا ہوں۔ موصوف کے خمیر میں تو بنگال کی مٹی اور دلّی کا پانی ہے۔ آب و ہوا تو انہیں اندرون ملک و بیرون ملک کئی شہروں کی نصیب ہوئی لیکن حیدرآباد کے تین سال کے قیام نے ان میں حیدرآبادی تہذیب وکلچر کی بیلیں پھیلادیں۔ اس کے بعد یہ جہاں جہاں جاتے رہے گو دلّی کے کہلائے لیکن حیدرآبادی کلچر کی نمائندگی کرتے رہے۔ سن ۱۹۸۱ء میں اندر ناتھ چودھری حیدرآباد اس لیے آئے تھے کہ انہیں دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کے ڈائرکٹر کی کرسی سنبھالنی تھی اور ساتھ میں پروفیسر کی حیثیت سے ہندی پڑھاتے ہوئے ہندی زبان کا چرچا بھی کرنا تھا۔ ہندی کا پرچار تو یہ کرتے رہے لیکن ساتھ میں اردو کو بھی رکھا۔ وہ سواد جو انہیں میؔر اور غالبؔ کی شاعری سے ملا تھا وہ ہمیشہ خوب تر رہا۔ حیدرآباد سے جب وہ ساہتیہ اکاڈمی دلی کے سکریٹری بن کر گیے تو مجھے اکاڈمی کا جو پہلا دعوت نامہ ملا اس پر چھپا تھا۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

اسی ماہ ۱۵ ؍ستمبر ۲۰۰۸ء کے دن اندر ناتھ چودھری حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے مہمان بن کر لکچر دینے آئے تو لکچر کے بعد انہیں جو بھی وقت ملا وہ صرف حیدرآبادیوں، حیدرآبادی تہذیب اور اردو کلچر پر گفتگو میں گذرا۔ انہوں نے مجھے ایسے دوستوں کے نام یاد دلائے جنہیں میں بھی آج کل کم ہی یاد کرنے لگا ہوں۔ سید عبدالقدوس ایڈوکیٹ، اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد کے عبدالباری (باری بھائی) اور سنگارینی کالریز کے محسن علی (محسن بھائی) بھی ان

احباب میں شامل تھے جن کے ساتھ ہماری اور اندر ناتھ چودھری کی بیٹھکیں ہوتیں اور علم و ادب کی محفلیں۔ وہ ستمبر ہی کا مہینہ تھا آج سے کوئی پچیس سال قبل عالم خوندمیری صاحب نے مہاویر ہاسپٹل میں اپنی زندگی کی آخری سانس لی تھی۔ چودھری صاحب نے میت کے پاؤں چھوئے۔ آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا ''اب ایسا کوئی اسکالر زندگی میں نہیں ملے گا'' عالم خوندمیری ہی کیا ان کی بیگم خدیجہ خوندمیری اور ان کے بچے، عزیز آرٹسٹ، ان کی بیگم شاہدہ اور بچے، اختر حسن، ان کی بیگم ریاست خانم اور ان کے لڑکے ایمن اور ان کی فیملی، خودمیری بیگم اکبر قادری اور ہمارے بچے، مغنی تبسم اور ان کے شاگرد، نرسنگ راؤ صاحب، آئزک سیکوئیرا، سید سراج الدین، تقی علی مرزا اور ایم ٹی خان۔ کبھی کبھی وحید اختر اور انور معظم و جیلانی بانو سے بھی ملاقاتیں ہو جاتیں۔ ان سب کو یاد کیا اور ان احباب کو بھی جن سے بہت کم ملنے کا موقع ہوا کرتا۔ سی آئی ای ایف ایل کی سوزی تھارو، عثمانیہ یونیورسٹی کے ایس کے کمار اور رماملکوٹے، جواہر لال نہرو انجینئرنگ کالج کے پرمود شنڈے اور کبھی کبھی سعید بن محمد۔ اندر ناتھ چودھری کا وقت ان دنوں دکشن ہندی پرچار سبھا میں اتنا ہی گزرتا جتنی وہاں ضرورت پڑتی۔ تھوڑا بہت وقت اپنی رہائش گاہ پر اور باقی کا بہت سارا وقت ہم لوگوں کے ساتھ ہی گزرتا۔ ۱۵ ؍ستمبر ۲۰۰۸ء کی اس ملاقات میں انہوں نے سب احباب کو یاد کیا۔ اب تو ان میں سے بہت کم رہ گئے ہیں۔ عالم نہیں رہے۔ قدوس، باری بھائی، محسن بھائی، سراج صاحب، اختر صاحب، سعید بن محمد، آئزک سیکوئرا، کھیپ کی کھیپ چلی گئی۔ ''بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔'' والا معاملہ ہے۔ کسی بھی چمن کی اپنی بہار ہوتی ہے۔ دانشور، بہار ہو کہ خزاں سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ اور جب پت جھڑ کا موسم شروع ہوتا ہے تو کمر باندھے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

اندر ناتھ چودھری کوئی تیرہ سال تک ساہتیہ اکاڈمی کے سکریٹری رہے۔ وظیفہ پر انہیں

وہاں سے سبکدوش ہونا پڑا تو نہرو سنٹر لندن کے ڈائرکٹر بن کر انگلستان گئے۔ دلی ہو کہ لندن یا کلکتہ وہ کسی نہ کسی پروگرام کی بدولت حیدرآباد آتے رہے۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران مہینے میں دو تین چکر ہو جاتے تھے۔ کچھ عرصے تک وہ یہاں اپنی فیملی کے ساتھ بھی رہے لیکن چوں کہ ان کی مسز اوشا چودھری دلی یونیورسٹی میں سنسکرت کی پروفیسر تھیں اس لیے وہ یہاں زیادہ رہ نہیں سکتی تھیں۔ چودھری صاحب ابھی حیدرآباد ہی میں تھے اور میرا دلی جانا ہوا تو ان کی ماتاجی حیات تھیں۔ انہیں ہم دونوں کی دوستی کا علم ہو چکا تھا۔ باوجود یہ کہ ماضی میں مسلم کلچر کے لوگوں سے زیادہ میل جول نہیں تھا، تاہم میرے ان کے ہاں قیام کے دوران پہلی ہی بار انہوں نے کہا۔ ''اندرناتھ میرے چاروں بیٹوں میں سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ صرف ایک بڑی بہن ہے۔ سب کا چھوٹا بھائی ہے۔ تم بھی اسے اپنا چھوٹا بھائی سمجھنا۔ جتنا شریر ہے اتنا ہی نادان بھی ہے۔'' اب میں سوچتا ہوں تو میں نے بہت کم ان کے ساتھ بڑے بھائی کا سلوک کیا البتہ وہی میرے بڑے بھائی بنے رہے۔ ایک نہیں بے شمار واقعات ہیں۔ زیادہ نہیں دو ایک کا ذکر کیے دیتا ہوں۔ اس کڑی کی اہم بات تو یہ ہے کہ جب بھی ہم دونون کا کسی محفل میں جانا ہوتا وہ میرے ساتھ لگے رہتے۔ کبھی کبھی ہدایات بھی دیتے کہ ایسا کیجئے اور ایسا مت کیجئے۔ یہاں تک کہ جب ہندوستان کے ادیبوں کے وفد میں شامل ہو کر مجھے قازقستان جانا ہوا تو اندرون قازقستان ٹرین کے سفر کے دوران میرا برتھ اپنے کمپارٹمنٹ ہی میں لگوا دیا۔ وفد میں شامل میرے نام کی منظوری بھی انہوں نے ہی حاصل کی تھی۔ رات میں دیر تک سفر جاری رہا تو چودھری صاحب اور میں صدر یو آر اننت مورتی کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے رہے۔ مذہبی مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔ صدر میری ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور چودھری میری مخالفت کرتے رہے۔ سونے کے لیے جب ہم اپنے اپنے برتھ پر لیٹ گئے تو کہنے لگے۔ ''گڑبڑی کی نا آخر آپ نے۔ مذہب پر آپ مجھ سے کسی بھی طرح کی بحث کر سکتے ہیں۔ صدر سے یہ

سب کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ مانا کہ وہ بہت سیکولر نظریہ کے آدمی ہیں لیکن ہر شخص تو آپ کی طرح سیکولر نہیں ہو سکتا۔ اب وہ آپ کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ کسی شخص کو اپنے عقیدہ کے بارے میں کچھ بھی کہنے کا حق ہے۔ لیکن اسے نہیں چاہئے کہ دوسروں کے عقیدہ کے خلاف کہے''۔ میں نے جواب دیا، ''میں تو وہی کہوں گا جس پر میں یقین رکھتا ہوں۔'' اس طرح رات دیر گئے تک میں چھوٹے بھائیوں کی طرح اپنی ضد پر اڑا رہا اور وہ مجھے بڑے بھائی کی طرح سمجھاتے رہے کہ کسی کو منوانے کے لیے بحث نہیں کرنا چاہئے اور یوں بھی جو شخص یہ سوچتا ہے کہ بحث جیت گیا وہ اپنے دوست کو کھو دیتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ دانشوری کی روایت کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے لیکن اس رات چودھری صاحب نے جو بھی کہا وہ دانشوری سے خالی نہیں تھا۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ وہ کسی غلط بات پر مجھ سے اُلجھ گئے۔ بعد میں انہیں احساس ہوا تو معذرت کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کی۔ اس موقع پر بھی مجھے محسوس ہوا کہ یہ بھی ایک بڑے بھائی کا ہی کردار ہے کہ وہ اپنی غلطی کی صفائی پیش کرتے ہیں۔

برسوں کی رفاقت کے بعد میں آج سوچتا ہوں کہ اندرناتھ چودھری میں وہ کونسی صفت ہے جو سب سے نمایاں اور افضل ہے۔ پیچھے کی طرف لوٹتا ہوں تو مجھے فوراً یاد آتا ہے کہ انہوں نے میرا نام ساہتیہ اکاڈمی دلی کی جنرل کونسل کے لیے تجویز کیا تھا۔ انتخاب کا قطعی فیصلہ ان کے ہاتھ میں نہ تھا۔ یہ کام وہ اردو شعبہ کے کنوینر سے کروا سکتے تھے۔ پھر اس کے لیے ملک کے کسی ادبی ادارہ کی سفارش بھی درکار تھی۔ ساہتیہ اکاڈمی کی جنرل کونسل کا ممبر وہی بن سکتا ہے جس کے مراسم ان صاحبانِ اقتدار سے ہوں جو اس ادارہ سے پہلے سے وابستہ ہیں۔ چناں چہ یہی ہوا عام آدمی چاہے وہ ادبی بلندی کی کسی سطح پر کیوں نہ ہو اس آدمی کے مقابلے میں ہیچ ہے جس کے روابط صاحبِ اقتدار سے ہیں۔ اسے ابھیمانیو کا چکرویو سمجھئے۔ اس سے وہی نکل سکتا ہے جسے گرو کا آشیرواد حاصل ہے۔ ابھیمانیو اس لیے چکرویو سے نکل نہیں سکا کہ

اسے گرو کا آشیرواد نہیں تھا۔ ساہتیہ اکاڈمی کے معاملے میں گرو در گرو آشیرواد کی ضرورت تھی۔ وہ اندر ناتھ نے فراہم کی اور ان کی ساہتیہ اکاڈمی میں بارہ سال کی تپسیا کے بعد انہیں بہرحال اتنا اختیار تو ملا کہ اپنے ایک دوست کے لے سفارش کر دیں۔ قصہ مختصر ایک دن انہوں نے میرے گھر پر فون کیا۔ میں موجود نہیں تھا تو میری بیگم کو انہوں نے مبارکباد دی کہ میرا انتخاب ساہتیہ اکاڈمی کی جنرل کونسل کے ایک ممبر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ بیگم نے اسے راجیہ سبھا کے ممبر کے برابر سمجھا۔ گھر پہنچنے پر مسرور و شاداں مجھے اس کی خوش خبری دی...... میں یہ سوچتا رہا کہ چودھری صاحب کو میری سفارش کرنی ہی تھی تو انہوں نے بارہ تیرہ سال کیوں لگائے۔ بات کو سمجھنے میں مجھے وقت نہیں لگا۔ ۱۹۹۲ء میں میرے افسانوں کے مجموعہ ''ادھورا سفر'' پر تنقیدی جائزہ لینے کے لیے ادبی محفل کا انعقاد ادارہ شعر و حکمت کے زیر اہتمام ہوا تو پروفیسر بیگ احساس نے میرے افسانوں کی توصیف میں جو کچھ کہا اس سے تمام حاضرین متاثر ہوئے۔ اتفاق تھا کہ اس محفل میں اندر ناتھ چودھری بھی شریک تھے۔ اس کے بعد ہی انہوں نے فیصلہ کیا کہ میری سفارش کی جاسکتی ہے۔ اس اجلاس سے قبل اور اس کے بعد کے واقعات پر غور کرتا ہوں تو انہوں نے مجھے حیدرآباد، دلی یا لندن کے ترجمے ورکشاپ ہوں یا ٹریونڈرم کا بھاسہ، مہوتسوا میرے ترجموں کی بنا اور ڈراموں سے میری وابستگی کی بنیاد پر ان میں شرکت کی دعوت دی۔ ان واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اندر ناتھ چودھری میں بہت سی خوبیاں تو ہیں لیکن جو سب سے افضل ہے وہ ان کا صداقت پسندانہ رویہّ۔ انصاف سے اور خود اپنی ذات سے کمٹ منٹ کا ہے جسے وہ صدق دل سے پورا کرتے ہیں۔ اور اگر راہ میں بڑے سے بڑا روڑہ آجائے تو اس کی پروا نہیں کرتے۔ کبھی ان سے غلطی ہوسکتی ہے لیکن یہ غلطی ارادۃً جان بوجھ کر نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ غلط فہمی کا سبب لاعلمی ہوسکتا ہے۔ غلط فہمی کسی کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ کارل مارکس سے ہوسکتی ہے، ماوزے تنگ سے، جان ایف کینڈی

سے اور وریدہ سے بھی جس نے آخری وقت میں اپنے تبلیغی ایجنڈے سے دستبرداری اختیار کر لی تھی۔ ''راستے کے روڑے'' کا میرا ایک چشم دید واقعہ ہے۔ بی جے پی کی حکمرانی کا دور تھا۔ جناب کے نارائن صدر جمہوریہ تھے۔ للت کلا اکاڈمی میں ان کا پروگرام تھا۔ سیکورٹی نے پوری عمارت کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ صدر جمہوریہ سے قبل کوئی اندر آ نہیں سکتا تھا۔ للت کلا اکاڈمی، سنگیت کلا اکاڈمی اور ساہتیہ اکاڈمی کی تینوں عمارتیں ایک ہی احاطہ میں ہیں اور ان کا باب الداخلہ بھی ایک ہی ہے۔ صدر جمہوریہ داخل ہونے ہی والے تھے کہ اسی لمحہ ساہتیہ اکاڈمی کے صدر کی کار داخلے کی گیٹ تک پہنچ گئی۔ سیکورٹی نے انہیں روک دیا۔ اسے دیکھتے ہی سکریٹری ساہتیہ اکاڈمی اندر ناتھ چودھری ایک شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے باہر آئے۔ کہا ''یہ ساہتیہ اکاڈمی ہے۔ یہ راستہ پہلے ساہتیہ اکاڈمی والوں کے لیے ہے۔ کوئی انہیں کیسے روک سکتا ہے؟'' سکریٹری کے غصہّ اور تیور کو دیکھتے ہوئے سیکورٹی نے فوراً ساہتیہ اکاڈمی کے صدر کی کار کو راستہ دے دیا۔ اس دن پہلی بار اندر ناتھ چودھری کو میں نے اس کیفیت میں دیکھا۔ دیر تک حیرت و استعجاب میں ڈوبا رہا کہ وہ شخص جو ہمیشہ مسکرا کر اور دل موہ لینے والے انداز میں بات کرتا رہتا ہے کس طرح اس غیض و غضب میں آسکتا ہے۔

اندر ناتھ چودھری ساہتیہ اکاڈمی کے سکریٹری جب بنے تو ان کے ابتدائی دور کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ان کے جائزہ لینے سے قبل ہی حکومت کا دباؤ تھا کہ اکاڈمی کے دستور میں ترمیم لائی جائے۔ حکومت چاہتی تھی کہ صدر کو نامزد کرے۔ ادیبوں شاعروں کو اسے قبول کرنا ناممکن تھا۔ سکریٹری پر بھاری ذمہ داری تھی۔ وہ خود بھی حکومت کی اس مداخلت کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ علم و ادب کا ایک خود مختار ادارہ حکومت کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑا جاسکتا ہے۔ چودھری نے زمین و آسمان ایک کر دیے۔ شخصی طور پر ایک ایک ادیب و شاعر سے ربط پیدا کیا۔ سارے ملک میں جن دوستوں کو خطوط لکھ سکتے تھے لکھے۔ ان سے محضر منگوائے۔ سیاست دانوں سے قطع

تعلق کرتے ہوئے حکومت کے کارندوں سے ملاقاتیں کیں۔ سیاست دانوں کے خطرناک رجحان سے انہیں آگاہ کیا۔ ان دنوں اندرناتھ چودھری کے بڑے بھائی ایم ین چودھری حیات تھے۔ وہ حکومت ہند میں پرنسپل سکریٹری تھے۔ ان سے بھی مدد لی۔ غرض چاروں طرف سے حکومت کی اس تحریک کے خلاف یلغار ہوئی۔ چند مہینوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور اس نے اپنی تحریک واپس لے لی۔ ان ہی دنوں مجھے یقین ہوگیا کہ اندرناتھ چودھری ایک پروفیسر اور درس و تدریس سے وابستہ ہوکر بھی بڑی انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ چناں چہ انہوں نے اپنے تیرہ سال کے دور میں اکاڈمی کے معیار کو بلند کرنے میں ایسے کارنامے کردکھائے کہ دانشوروں کو کہنا پڑا ''پروفیسر اندرناتھ چودھری، کرشنا کرپلانی کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔ کرشنا کرپلانی نے ساہتیہ اکاڈمی کے ابتدائی دور سے سولہ برس تک معتمدی کے فرائض انجام دیتے ہوئے اکاڈمی کی بنیاد کو پائیداری بخشی تو اندر ناتھ چودھری نے اپنے تیرہ سالہ دور میں اس کی دیواروں اور چھت کو مضبوط بنانے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

اندرناتھ چودھری میں بعض اور بھی خصوصیات ہیں۔ وہ موقع اور محل سے ابھرتی رہتی ہیں۔ ظرافت، طنز و مزاح ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ کبھی کوئی دوست ہو کہ کوئی حریف ان کی کمزوریوں کی نشاندہی کرے تب وہ ایک مختلف ہی شخص دکھائی دیتے ہیں۔۔ کمزوریوں کی نشاندہی کرنے والا کوئی حریف ہو تو خوب قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں۔ لیکن وہ اگر کوئی دوست ہوا تو خاموش ہوجاتے ہیں اور یہ کہہ کر مان لیتے ہیں'' آپ سچ کہہ رہے ہیں'' شاید اس کے بعد تنہائی میں خود احتسابی کرتے ہوں گے اور جب دوستوں کے درمیان خوش گپیاں ہونے لگیں تو ایسے ایسے لطیفے سنائیں گے کہ ساری محفل زعفران زار ہوجائے۔ حکایتیں بھی سناتے ہیں۔ ہندو میتھالوجی کی مختلف کہانیاں تو ان کی نوکِ زبان پر ہیں۔ ان سے بہت سنا۔

بہت اکتساب کیا۔ انہیں میں نے ایک ایسا مخلص دوست پایا جس نے میرے ساتھ ایک بھائی کا سلوک کیا۔ کیا میں ایسے دوست کی ان تمام خوبیوں کو اپنے لیے وسیلۂ ظفر نہ سمجھوں؟ بہت کم لوگوں کو ایسے دوست نصیب ہوتے ہیں۔

اکتوبر ۲۰۰۸ء

◆◆◆

انور رشید سے وابستہ چند یادیں

(انور رشید کے افسانوں کے دوسرے مجموعے "پھر گرفتار ہم ہوئے" کی رسم اجرا کے موقع پر)

انور رشید حیدر آباد کے اُن شاعروں اور افسانہ نگاروں میں سے ایک تھا جو اپنی طبعی عمر کے پہنچنے سے بہت قبل رحلت کر گیا۔ اس کے قریبی دوست بہت زیادہ تو نہیں رہے لیکن جو بھی تھے وہ آرٹسٹ اور فن کار تھے۔ چند ایسے بھی رہے جن پر بوہیمین ہونے کا الزام آتا ہے۔ عزیز آرٹسٹ، اکرام (مہر نگار کے بھائی اور تبو کے ماموں) اور انور رشید میں خوب چھنتی تھی۔ اور بھی کچھ لوگ رہے ہوں گے میں ان سے واقف نہیں ہوں۔ انور رشید کی بے راہ روی میں ایک بانکپن تھا اور کبھی کبھی خود مجھ میں اچانک بے قابو ہو جانے کی صفت انور رشید کی اسی صفت سے تھوڑی بہت میل کھاتی رہی۔ شاید یہی اسباب ہوں گے کہ میں اس سے نہ صرف ہمدردی رکھتا تھا بلکہ یہ ہمدردی چاہنے کی حد تک تھی۔ میں ایسا سمجھتا رہا یہ جانے بغیر کہ خود انور رشید میرے بارے میں کیا سوچتا تھا۔

مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں انور رشید سے کب اور کہاں ملا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ جب ملا تو وہ مجھے پری زاد لگا اور جب اُس کی شریکِ حیات اور بچوں سے ملاقات ہوئی تو سب کے سب مجھے پری زاد لگے۔ گورے گورے بڑے ہی تیکھے ناک نقشوں کے جیسے کسی کوہستانی خطے کے باشندے ہوں۔ یہ کیفیت بہت تیزی سے بدلتی رہی۔ انور رشید شاید پہلے سے شراب اور ٹھرے کا عادی تھا۔ شراب اس کی شریکِ حیات کی سوتن بنی اور اس کی بے راہ روی اور لاپروائی نے اس کے بچوں کی آسودگی چھین لی۔ نہیں معلوم بچے کس طرح پروان چڑھے۔ ماں کے اسکول ٹیچر ہونے کا سہارا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ ایک دن اچانک اس کے گھر والوں نے اطلاع دی کہ انور رشید نے اپنی آخری سانس لے لی ہے۔ اور اس کی تدفین کا انتظام کرنا ہے۔ میں اپنا منھ لٹکائے بھاگا بھاگا "سیاست" کے جائنٹ ایڈیٹر محبوب حسین جگر صاحب کے پاس پہنچا۔ انھوں نے کچھ رقم میرے حوالے کی۔ وہ زمانہ تھا کہ اخباروں کے مالکین نہ صرف زندہ ادیبوں کی تحریروں پر کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے بلکہ کسی بھی ادیب کی کسمپرسی کی خبر بھی لیتے تھے۔ کسی کو قبر میں لٹا کر اُس پر منوں مٹی ڈالنا بڑا جان کنی کا لمحہ ہوتا ہے۔ اس پری زاد کو اس کے لحد کی آخری منزل تک پہنچا کر اور چالیس قدم چل کر اوروں کے ساتھ میں بھی باہر آ گیا اور زندگی کی تگ و دو میں لگ کر انور رشید کو بھول گیا۔ کئی برسوں بعد اُس کے بچوں سے اُس وقت ملاقات ہوئی جب وہ جوان ہو چکے تھے۔ اس کے بڑے لڑکے عرفان احمد صدیقی نے مجھ سے کہا تھا "انکل! ابا کے افسانوں کو چھپوانے کا کچھ انتظام کیجیے۔ اخراجات میں برداشت کروں گا۔"

انور رشید کے افسانوں کے دوسرے مجموعے کا مسودہ کتابت ہو کر تیار تھا۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں اسے مکمل کر لیا تھا۔ پیش لفظ مجھ سے لکھوایا۔ اس وقت "زوال کے مقابل" والے افسانوں کے تفہیم میرے ذہن میں تازہ تھے۔ پیش لفظ کا ایک جملہ انور رشید کو سنا کر میں نے کہا تھا اسے اگر اعتراض نہ ہو تو چھپوا سکتا ہے ورنہ اس کی مرضی۔ جملہ تھا "تمھارے افسانوں میں تسلسل نہیں ہے۔ ایک افسانے کا کوئی بھی پیراگراف دوسرے افسانے کا حصہ بن سکتا ہے۔" اس نے ایک لمحہ توقف کے بغیر جواب دیا۔ "جی ہاں یہی میرا ذہنی تسلسل ہے۔" میں لاجواب ہو گیا۔ عوض سعید نے لکھا ہے "انور رشید ایک زبردست کرتب باز تھا۔" میرا خیال ہے اس میں اتنی سوجھ بوجھ تھی ہی نہیں کہ وہ کرتب بازی کرتا۔ اس نے آسمان پر پہنچنے کے لیے زمین پر کبھی سیڑھی نہیں لگائی۔ وہ جانتا تھا کہ آسمان پر پہنچ کر بھی ایک شخص مٹی کا تودہ ہی رہے گا۔ تاہم وہ ہواؤں میں ضرور اُڑتا رہا۔ جان بوجھ کر آندھیوں کی زد میں آنا اُسے پسند تھا۔ دروغ گو اور خود غرض انسانوں کے درمیان وہ کبھی کبھی نیم پاگل اور نیم وحشی ہو جایا کرتا۔ اس کا یہ عمل غیر اختیاری تھا۔ مسودہ کئی دنوں تک حلف کے رکارڈ میں پڑا رہا۔ بیگ احساس نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ پتہ نہیں دوبارہ وہ کس طرح اور کہاں

غائب ہوگیا۔ مظہر مہدی نے پھر سے اسے تلاش کیا۔ دوبارہ اس کی کمپیوٹر پر کتابت ہوئی۔ کچھ کاغذات ضائع ہوگئے۔ وقت کی نظر بڑی جناتی ہوتی ہے۔ نہیں معلوم وہ کیوں کسی کو کھا جاتی ہے۔ غنیمت یہ ہے کہ اس کی بری نظر ابھی تک ہم پر نہیں پڑی ورنہ انور رشید کے دوسرے مجموعے کی رسم اجرا کے موقع پر ہم یہاں نہیں ہوتے!!

یوں تو انور رشید کے ساتھ گزارا ہوا جو بھی وقت تھا یادوں میں بسا ہوا ہے لیکن میں یہاں صرف دو اہم واقعات کا ذکر کروں گا۔ سنہ اور تاریخ تو یاد نہیں ہے۔ ان دنوں اقبال متین کسی عارضے میں مبتلا درشہوار ہاسپٹل میں شریک تھے۔ میں، عزیز آرٹسٹ اور سید عبدالقدوس وہاں پہنچے تو پہلے سے انور رشید اور اکرام وہاں موجود تھے۔ عیادت کے بعد ہم پانچوں ایک ساتھ باہر آئے تو عزیز نے خیال ظاہر کیا کیوں نہ دوپہر رام کرشنا پورم میں گزاری جائے۔ ان دنوں دلسکھ نگر سے آگے یتیم خانے کے روبہ رو رام کرشنا پورم میں میری والدہ کا چھوٹا سا پولٹری فارم تھا۔ راستے میں ہم لوگوں نے شراب کے ساتھ چند اور پراویژن خریدے، انور رشید نے لحم کو بھونا اور جوار کی روٹیاں بھی تیار کیں۔ انور رشید کے ہاتھ کا پکوان اس قدر لذیز تھا کہ ویسا گوشت میں نے پہلے کبھی نہیں کھایا اور نہ اس دن کے بعد۔ شام سے پہلے ہم لوگ شہر واپس ہونا چاہتے تھے۔ ملک پیٹھ تک کوئی سات کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ روانہ ہوئے تو ہلکی سی بوندا باندی شروع ہوچکی تھی۔ مشکل سے ایک کیلومیٹر کا سفر طے کیا ہوگا کہ کار چلاتے ہوئے میں نے پیچھے اونچی اونچی آوازیں سنیں۔ پھر اچانک انور رشید نے اصرار کیا کہ میں کار روکوں۔ کار رکی تو وہ اتر گیا اور پیدل چلنے لگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے کار چلاتا ہوا قریب پہنچا۔ میں نے کہا ''کار نے تمھارا کیا بگاڑا ہے کہ اُسے سزا دے رہے ہو؟'' کہنے لگا۔ ''میں کسی کمینے کے ساتھ سفر نہیں کرسکتا۔'' میں یہ فیصلہ نہ کرپایا کہ ہم پانچوں میں کمینہ کون تھا۔ باپ کا بیٹا انور رشید ٹس سے مس نہ ہوا۔ میری ایک نہ مانی اور ملک پیٹھ تک اُسی بوندا باندی میں بھیگتا ہوا پیدل پہنچا۔ اُس کے بعد کیا ہوا مجھے یاد نہیں۔

دوسرا واقعہ ذرا زیادہ ہی عبرت انگیز ہے۔ ایک رات عزیز آرٹسٹ اور انور رشید کو

حوالات میں گزارنا پڑا تھا۔ انور رشید نے اس واقعے کو اپنے ڈرامے ''پھر گرفتار ہم ہوئے'' میں قلم بند کیا ہے۔ حفیظ اور حمید کے کردار تو بالکل حقیقی ہیں لیکن اس نے منیر کو ایک صنعت کار کے کردار میں پیش کرتے ہوئے اسے نہ صرف دل چسپ بلکہ عبرت انگریز بنادیا۔ فکشن کی یہی تو خوبی ہے کہ کردار حقیقی نہ ہوکر بھی سچے لگیں ورنہ محض حقیقت نگاری فکشن کو سپاٹ بنادیتی ہے۔ میں نے انور رشید کو داد دی کہ خود میرے کردار کو وہ منیر کے رنگ میں پیش نہ کرتا تو ڈراما بے جان ہوجاتا۔ لیکن اب میں انور رشید کے رویے پر غور کرتا ہوں تو اُس نے خود اپنے ساتھ اور اپنے ہی خواہوں کے ساتھ بڑی ناانصافی کی۔ اس کا نقصان خود اس کی ذات کو ہوا اور اس کی فیملی کو۔ کتنے ایسے فن کار نہیں ہیں جو اپنی تحریروں کے ذریعے سماج میں ہونے والی خباثتوں کو بے دردی سے آشکار نہیں کرتے۔ وہ قارئین کو اور اہلِ اقتدار کو عبرت دلاتے ہیں اور ان کی رہبری کرتے ہیں کہ کس طرح انھیں اپنے ماحول کو سنوارنا ہوتا ہے۔ سچائی اور انصاف کی راہ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ برخلاف انور رشید کا نام ان ادیبوں کی فہرست میں آتا ہے جو اپنی تحریروں کے ذریعے براہ راست نشتر چلاکر مخالفین کو زخمی کردیتے ہیں۔ انور رشید تیکھے اور تیز و تندلب و لہجے کا فن کار تھا۔ اسے احساس تھا کہ لوگوں کے کان پر جوں رینگتی محسوس نہیں ہوتی۔ یہی سبب ہوگا کہ اُس نے سماج کے بے حس لوگوں کے علاوہ اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنے مخالفین میں شمار کیا۔ اُسے شاید معلوم نہ تھا کہ زندگی ان لوگوں کے ساتھ بھی خوش اسلوبی سے پیش نہیں آتی جو اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اس نے زندگی کے ساتھ ایک طرح سے کھلواڑ کیا۔ میں نے اسے ہنستے ہوئے بھی بہت کم دیکھا۔ قہقہہ مارنا تو وہ جانتا ہی نہ تھا۔ اس کے باوجود اس میں ایک ادا تھی کہ احباب اُسے چاہتے تھے۔ اُس نے بہت کم لکھا اور اُس کے قارئین بھی بہت کم تھے۔ اس نے اپنی ذات سے ہی سمجھوتا نہ کیا تو دوسروں سے کیا کرتا۔ وہ بہ یک وقت غیرت مند اور سر پھرا تھا۔ دوستوں کے ساتھ ہوکر بھی وہ اپنے کو تنہا اور منفرد محسوس کرتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ادب میں اُس وقت تک ضرور زندہ رہے گا جب تک اس کے ہم عصر ادیب زندہ رہیں گے۔

مئی ۲۰۰۸ء

•❖•

حسن عسکری کی یاد میں

(اُپنشد کے حوالے سے)

۲۱ رفروری ۲۰۰۸ء دوپہر کے وقت علی ظہیر نے عزیز آرٹسٹ کے اسٹوڈیو سے فون کیا
'' آپ کو ایک منحوس خبر سنانی ہے، کل ہی حسن عسکری صاحب رحلت کر گئے ،بعض اخبارات میں خبر شائع ہوئی ہے، وہ اپنے بیٹے موسیٰ کے پاس انگلینڈ (Middlesborough) میں مقیم تھے، نمونیا سبب بتایا گیا ہے۔''

ایک ہفتہ قبل ہی علی ظہیر نے حسن عسکری کی تالیف وترجمہ ''اُپنشد'' مجھے پڑھنے کے لیے دی تھی، اُپنشد سے میرا پہلا تعارف عسکری صاحب ہی کے توسط سے ہوا تھا۔۱۹۶۰ء کے آس پاس جب میں آرٹس کالج میں پڑھتا تھا عسکری صاحب کالج کے ان اساتذہ میں سے تھے جن سے میری ملاقات ہوا کرتی، کالج کے اس دور کے اساتذہ جن سے میں بعد میں بہت قریب ہوا وہ عالم خوندمیری صاحب ، مغنی تبسم صاحب اور حسن عسکری صاحب ہی تھے۔ عسکری صاحب کا تعاون طالب علموں کے ساتھ ہمیشہ ہی رہا بلکہ چند طالب علم ان کے قریبی دوست بھی رہے، چناں چہ ہم لوگوں نے جب یو۔ین۔او (U.N.O.) کی ماک اسمبلی کا پروگرام ترتیب دیا تو عسکری صاحب ہی اس کے روح رواں تھے اور انھوں نے یو۔ین۔او کی جنرل اسمبلی کے سکریٹری ڈاگ ہیمشولڈ کا رول بھی ادا کیا تھا۔

اب یاد کرتا ہوں تو اُپنشد کے جن دو ڈسکورسس کا ذکر عسکری صاحب نے مجھ سے اُسی زمانے میں کیا تھا وہ گرو اور چیلے کے درمیان مکالمے تھے، ایک مکالمے میں گرو اپنے چیلے کا امتحان لیتا ہے :

گرو : ''جب سورج ڈوب جائے گا تو تم کیا کرو گے۔''
چیلہ : ''میں چاند تاروں کی روشنی سے استفادہ کروں گا۔''
گرو : ''جب چاند تارے بھی غروب ہو جائیں تب۔''
چیلہ : ''تب میں شمع جلاؤں گا۔''
گرو : اور جب شمع بھی بجھ جائے گی تو تم کیا کرو گے؟''
چیلہ : ''تب میں بات کروں گا۔''
گرو : ''اور جب بات کرنے کی صلاحیت بھی سلب کر لی جائے۔''
چیلہ : ''تب میں سوچوں گا۔''

دوسرا مکالمہ مختصر سا یوں ہے کہ دنیا میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے روانہ ہونے سے قبل چیلہ اپنے گرو سے کہتا ہے۔ ''اب میں خوف کے چنگل میں پھنس گیا ہوں، مجھ پر چاروں طرف خوف ہی خوف طاری ہے۔''

تب گرو نے اپنے چیلے کو خوف پر قابو پانے کا حوصلہ دیا۔ گرو نے کہا '' جب اس کائنات میں صرف تم ہی تم ہو تو خوف کس بات کا؟''

حسن عسکری نے ہندستان چھوڑتے ہوئے سورج ، چاند، تاروں اور شمع کی روشنیوں سے پرے اپنی ایک سوچ بنالی تھی ، وہ سارے انسانوں کو یکجا کرنا چاہتے تھے، اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا، اب تو وہ ایسی کائنات میں پہنچ گئے ہیں جہاں کسی طرح کا کوئی خوف نہیں ہے، البتہ وہ چند یادیں ہمارے درمیان چھوڑ گئے۔

دراز قد اور بے ڈول جسم کی ان کی شخصیت کئی اور شخصیتوں پر بھاری تھی، کسی بھی نئے

آدمی کو ان تک پہنچنے کے لیے سوچنا پڑتا لیکن جب ایک بار کوئی طالب علم ان کے دوبدو ہو کر انھیں سلام کر لیتا تو وہ ان کی شفقت بھری مسکراہٹ کا ہمیشہ کے لیے گرویدہ ہو جاتا، دوسری بار کلاس سے باہر اس طالب علم پر عسکری صاحب کی نظر پڑتی تو وہ اس کا نام لے کر بلاتے، کبھی کبھی اس کے کاندھے پر ہاتھ بھی رکھ دیتے، طویل قامت ہونے کی وجہ ان کا ہاتھ بڑی آسانی سے طالب علم کے کاندھے تک پہنچ جاتا اور طالب علم خوش ہو جاتا کہ ایک ماہر تعلیم اور ایک اہم شخصیت کی قربت اُسے حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر عسکری صاحب اس وقت کینٹن جا رہے ہوتے تو اس طالب علم کو بھی اپنے ساتھ کر لیتے، چائے کی چسکی لیتے ہوئے سگریٹ کی ڈبیا اپنے ڈھیلے ڈھالے کوٹ کی جیب سے نکالتے، ایک سگریٹ طالب علم کو بھی پیش کرتے، اگر خود ان کی جیب میں سگریٹ نہ ہوتا تو طالب علم سے پوچھ بیٹھتے کہ وہ سگریٹ پیتا ہے کہ نہیں؟!

عسکری صاحب جس ذوق وشوق سے کلاس میں طلبا کو پڑھاتے اُسی لطف اندوزی کے ساتھ اپنے دوستوں کی محفل کو گرماتے، کلاس میں تو سماجی علوم اور متعلقہ کتابوں کا حوالہ دیتے ہی رہے ہوں گے لیکن دوستوں کے درمیان گفتگو کرتے ہوئے اور ادبی جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے میرؔ ہو کہ غالبؔ، اقبالؔ ہو کہ ن م راشدؔ اُن کے شعری محاسن پر کسی حوالے کے بغیر اپنی ذہانت کے بل بوتے گفتگو کرتے اور وہی کہتے جس پر ان کا یقین ہوتا۔ کارڈس کھیلنے، ریس کے گھوڑوں پر بازی لگانے اور تفریح گاہوں میں گھومنے پھرنے کا بھی انھیں شوق تھا۔ میوزک کی کسی دھن پر سر دھنتے اور ضرورت پڑنے پر اُس پر رقص کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ان کے بڑے لڑکے کی شادی کی برات بیانڈ باجے سے آگے بڑھ رہی تھی، انھوں نے ڈانس کرتے ہوئے ہم لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا، ہم میں سے بعض صرف ہاتھ ہلانا اور پاؤں تھرکانا جانتے تھے لیکن عسکری صاحب اس طرح ڈانس کر رہے تھے جیسے وہ اس فن سے واقف ہیں۔ کارڈس اور ریس کی بازیوں میں تو وہ اکثر ہار جاتے، اس کے بعد انھیں گھر جانا ہوتا تو وہ گھر نہیں جاتے بلکہ کسی دوست سے ربط پیدا کرتے۔ وہ شراب زیادہ نہیں پیتے تھے

لیکن شراب کی محفلیں انھیں پسند تھیں، اس وقت اگر دوست کے پاس بھی پیسے نہ ہوتے تو وہ بار کے بل پر دستخط کر دیتے، بار کا مالک خوش ہو جاتا اور ان کی اگلی آمد کا انتظار کرتا۔ بار سے نکل کر وہ ٹکسی والے کو بلاتے، اپنے دوست کو اس کی منزل پر چھوڑتے، گھر پہنچ کر وہ ٹکسی والے سے کہتے کہ انھیں دوسرے دن لینے آئے، ٹکسی ڈرائیور بھی خوش ہو جاتا کہ دوسرے دن اُسے سواری بھی ملے گی اور پیسے بھی زیادہ ملیں گے۔ انھوں نے کسی بار کے مالک یا کسی ٹکسی ڈرائیور کو مایوس نہیں کیا۔

ریس کورس میں عسکری صاحب کو اکثر جیتنے والے گھوڑوں کی ٹپ بھی مل جاتی، جیک پاٹ میں وہ اپنے دوستوں کو شامل کر لیتے، اس بھروسے پر کہ ان کے پچھلے نقصان کی تلافی ہو جائے گی لیکن عسکری صاحب کی شخصیت کی مار ایسی تھی کہ دوستوں کو دوبارہ ہارنے کا اندیشہ ہوتا تب بھی وہ عسکری صاحب کی اسکیم میں شریک ہو جاتے اور نتیجہ آنے پر فیصلہ کر لیتے کہ آئندہ وہ ان کی اسکیم میں حصہ نہیں لیں گے، لیکن ایسا کبھی نہ ہوا۔

یہاں ایک واقعہ کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں گو وہ اس مضمون میں ایک پیوند سا لگتا ہے لیکن اس سے عسکری صاحب کی اعلیٰ ظرفی کا اعلان ہوتا ہے۔ شہر کے اہم شاعروں اور ادیبوں نے مل کر طے کیا کہ ایک ادبی انجمن رائٹرس گلڈ کے نام سے قائم کی جائے اور اس کے زیر اہتمام ایک شاندار مشاعرہ بھی منعقد ہو۔ ان دنوں آغا حیدر حسن صاحب حیات تھے، وہ بہ اتفاق آرا صدر چن لیے گئے، صرف ایک ووٹ سے عسکری صاحب کو معتمدی کے عہدے پر جیت ہوئی، مخالف امیدوار نے اعتراض کیا کہ ایک ووٹر کی غلط فہمی سے عسکری صاحب کی جیت ہوئی ہے ورنہ یہ ووٹ ان کے حق میں تھا، عسکری صاحب بہ خوشی دوبارہ ووٹنگ کے لیے تیار ہو گئے، اس دفعہ مخالف امیدوار ایک ووٹ سے جیت گئے، عسکری صاحب نے بڑی خندہ پیشانی سے اس نتیجہ کو قبول کیا اور ادارہ کے تمام پروگراموں میں ہاتھ بٹایا۔

دراصل دوستوں سے عسکری صاحب کی والہانہ الفت کا سبب یہ تھا کہ انھیں دنیا کے

سارے انسانوں سے محبت تھی، چھوٹے ہوں کہ بڑے دوستوں کو کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ انھیں کسی سے زیادہ اور کسی سے کم ہے۔ ان دنوں جب وہ علی گڈھ میں تھے ایک بار میرا وہاں جانا ہوا، انھوں نے مجھے اپنے ساتھ سیکل رکشا میں بٹھالیا اور وہاں کی تمام تعلیمی عمارتوں کی سیر کرائی۔

زندگی کی بقا اور ابدیت پر عسکری صاحب کا اٹوٹ یقین تھا، ایک دفعہ وہ اپنے احباب کے ساتھ ناگر جونا ساگر گئے وہاں کشتی کی سواری کی، بیر کی چند بوتلیں خالی ہو چکی تھیں، انھوں نے ساحل سے چند موٹی موٹی کنکریاں جمع کیں، ایک کاغذ پر تمام احباب سے اپنے اپنے نام لکھوائے، خود اپنا نام اور اس روز کی تاریخ بھی درج کی، کاغذ کو بوتل میں کنکریوں کی مدد سے بند کیا اور اسے ساگر کی تہہ میں پہنچا دیا۔ ابدیت کا یہ تصور اور اس کا سرچشمہ عسکری صاحب کو کتھا اُپنشد میں نظر آیا۔ نچی کیتا اس نے روح اور ابدیت پر جو وضاحتیں کی ہیں اس کی تلخیص عسکری صاحب نے بڑے موثر انداز میں پیش کی ہے، آتما اور نفسِ اعلیٰ کی تلاش میں انھوں نے ان دانشوروں تک رسائی حاصل کی جو آتما کی رتھ پر سوار ہیں، عقل جس کی رتھ بان ہے، حواس کے گھوڑے اس رتھ کو چلاتے ہیں، آکاش میں کسی خوف کا گزر نہیں، نہ بڑھاپے کا نہ موت کا، بھوک پیاس اور غم وہاں چھو نہیں سکتے، اس کے ساکنان لافانی حیات کے حامل ہیں۔

ایک بار جب عسکری صاحب حیدرآباد آئے تھے تو ان کے چند احباب نے ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا اور انھیں اظہار خیال کی دعوت دی، اجلاس میں پہنچ کر وہ ان کے لیے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے، پھر بہت دیر تک اپنی آنکھیں میچ کر مراقبے میں چلے گئے، حاضرین خاموش ہی خاموش انھیں دیکھتے رہے، بہت دیر بعد جب انھوں نے آنکھیں کھولیں تو ان کی آنکھیں سرخ تھیں، اس کے بعد انھوں نے کیا کہا مجھے یاد نہیں اس لیے کہ میں صرف ان کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

مراقبے کی تمام مذاہب میں بڑی اہمیت ہے، مراقبے میں بیٹھا ہوا شخص اپنے ذہن کو

خارجی دنیا سے الگ کرلیتا ہے، اُپنشد کے مطابق اسے عظیم تر حیات کی تلاش ہوتی ہے، اس طرح کے عمل کو تصوف میں ''احسان'' کہتے ہیں۔ ''احسان'' میں خدا کی عبادت کی تلقین یوں ہے کہ بہ وقتِ عبادت خارجی دنیا سے الگ آپ صرف خدا کو دیکھ رہے ہیں یا پھر خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔ اُپنشد میں مراقبہ سے مراد برہما کا دیدار ہے، اسی طرح کوشی تا کی اُپنشد اور ستی ریا کی اُپنشد میں جو تعلیم دی گئی ہے وہ تصوف کی تعلیم ''راہِ سلوک'' کے مماثل ہے۔

حسن عسکری صاحب نے بارہ اُپنشدوں کی تلخیص پیش کی ہے، کئی کئی صفحات پر پھیلے ہوئے اس فلسفے کو انھوں نے کوزہ میں بند کردیا ہے۔ اپنشدوں کا درست ترجمہ مغربی زبان میں پہلی بار جرمن مفکر Paul Duessen نے کیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ بائبل کے مقولے "Love thy neighbour as love thyself" کی اس نے تشریح چاہی، اسے بائبل میں نہ ملی۔ جب پال ڈیوسن نے اُپنشد کو سنسکرت میں پڑھا تو اس مقولے کی تشریح کو اس میں پایا، تب اس کا ترجمہ اس نے اپنی مادری زبان میں کیا تاکہ اس کے ہم وطنوں کو اس کا فیض پہنچے۔ اسی طرح کا کام عسکری صاحب نے اپنی مادری زبان اردو بولنے والوں کے لیے انجام دیا ہے۔ اُپنشد میں اس مقولے کی وضاحت یوں ہے کہ ''جو جیو آتما تمھارے اندر ہے وہی جیو آتما تمھارے پڑوسی میں بھی ہے۔ تمھارا پڑوسی تم سے مختلف نہیں ہے''۔ اب عسکری صاحب ہم میں نہیں رہے لیکن ان کا کام باقی رہے گا۔

فروری ۲۰۰۸ء

•❖•

سلیمان اریبؔ

(حریفِ مئے مردافگنِ عشق)

کوئی پچاس سال پرانی بات ہے۔ حیدرآباد کے کسی مشاعرے میں ایک دراز قد، گورا سپیدی مائل رنگ، تیکھے نقوش والا ایک شخص گھنی اور لہراتی زلفوں کو اپنی مخروطی انگلیوں سے ادھر سے ادھر کرتا ہوا شعر سنا رہا تھا۔

پھر حافظؔ و غالبؔ کو جوانی دے دوں
خیامؔ کو پھر قالب ثانی دے دوں
اک پل کے لئے میں جو خدا ہو جاؤں
دنیا کو بس انگور کا پانی دے دوں

یہ کیسا شاعر ہے جو خدا بننے کی تمنا کر رہا ہے جبکہ اساتذہ نے اس تمنا کو "بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا" کہہ کر رد کر دیا تھا۔ سامعین کی طرف سے تالیاں بجیں اور واہ واہ! کا شور مچا تو میرے تصورات کی دنیا بکھر گئی۔ آدھے سامعین یکدم چپ تھے۔ باقی آدھوں میں چند شرارت سے اور طنز سے واہ! واہ! کر رہے تھے اور چند ایسے بھی تھے کہ ستائش اور توصیف میں داد دے رہے تھے کہ ایک دلفگار اور دلدوز جذبہ کے تحت شاعر خدا سے پل بھر کے لیے اقتدار مانگ رہا ہے کہ دنیا کے سارے انسانوں کی آرزوئیں پوری کر دے گا۔

جس وقت اریبؔ نے یہ رباعی کہی وہ صرف پچیس سال کے تھے۔ روس کے انقلاب سے متاثر اور کارل مارکس کے پرستار۔ غریب اور اوسط خاندانوں کے تعلیم یافتہ نوجوان ہی کیا دولت و ثروت اور زمینداروں کے طبقہ کے بعض نوجوان بھی اسی حسرت کو لیے میدان میں کود پڑے تھے۔ اریبؔ نے یہ رباعی ۱۹۴۷ء میں کہی اور ۱۹۴۸ء میں وہ کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ ممبر بن گئے۔ شاعری انہوں نے بہت کم کی لیکن ان کی شاعری میں مخدومؔ اور فیضؔ کی شاعری کے رجحانات ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

یقین پرستوں سے اوہام پھر الجھتے ہیں
خلیل زادوں سے اصنام پھر الجھتے ہیں

دوسرا شعر۔

تیرے کدال سے لرزاں ہے خواجگی کی اساس
ترے خیال سے ظلِ الٰہ کے گُم ہیں حواس

اس شعر کی تخلیق کے بعد انہیں دو سال تک سنٹرل جیل حیدرآباد اور ڈسٹرکٹ جیل بیڑ میں رہ کر شاعری کرنی پڑی۔ دوبارہ وہ ۱۹۵۲ء میں طلباء کی ہڑتال کی حمایت میں دو ماہ ڈسٹرکٹ جیل سکندرآباد میں قید رہے۔ اغلب ہے کہ زنداں کے حوالے سے کہا ہوا اُن کا یہ آخری شعر ہے۔

آج وہ ہند کا شہری نہیں کہلا سکتا
جس نے اک بار نہ زنداں کی ہوا کھائی ہو

اس کے بعد بہت جلد اریبؔ نے ۱۹۵۴ء میں کمیونسٹ پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں پارٹی سے خارج کر دیا گیا کہ شائد انہوں نے جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کیں کہ انہیں خارج کر دیا جائے۔ اب نعرہ بازی سے زیادہ انہیں ادب کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ بتیس سال کے ہو چکے تھے۔ ذیل کے مقولے پر پورے اترے:

"If a man below the age of thirty is not a

communist, he has no heart but if he continues to be so even after thirty, he has no head".

تاہم اریبؔ کا کمٹمنٹ اس مسلک سے جڑا رہا جسے انہوں نے اپنی نظموں میں پیش کیا۔ مسلک تھا عام انسان کی زندگی اور اس کے حقوق کی پاسداری، ظلم و استبداد سے بغاوت اور غلامی اور ریاکاری سے حقارت۔ اس مسلک کا تعلق قدیم زمانے سے دو طبقات کے درمیان ہونے والی لڑائی سے ہے۔ یہ لڑائی اریبؔ اپنی جوانی سے موت تک لڑتے رہے۔ اسی مسلک نے انہیں مذہبی جکڑبندیوں سے دور رکھا۔ ان کی چاہت شراب، عورت اور ادب سے شدید رہی۔ وہ اپنی بائیس (۲۲) سال کی عمر میں ''پیش کش'' جیسی نظم کہہ چکے تھے جو حُسن پرستی اور اعلیٰ ادب کی عمدہ مثال ہے۔ نظم کا دوسرا بند ہے۔

لالۂ و گل ہوں کہ نرگس ہو کہ سر و شمشاد
میں کسی سے بھی کوئی کام نہیں لے سکتا
تیرے رخسار و لب و چشم و قد و قامت کو
میں کسی چیز سے تشبیہ نہیں دے سکتا

شہزادی نیلوفر کے حُسن کی توصیف میں کہی ہوئی یہ نظم نیلوفر کو تو سنائی نہ جا سکی لیکن اریبؔ نے جب یہ نظم ایک سینئر شاعر کو سنائی تو اس نے کہا ''ارے اس نظم میں تو ''لف ونشر'' کی صنعت استعمال کی گئی ہے''۔ اس وقت تک اریبؔ ''لف ونشر'' کے مفہوم سے واقف نہ تھے۔ سینئر شاعر نے تشریح کی کہ اس نظم میں لالۂ و گل، نرگس و شمشاد کی تشبیہ، رخسار، لب و چشم اور قد و قامت سے بالترتیب دی گئی ہے۔ 'لف ونشر' کی صنعت کی ایک مثال ہے۔

اس واقعہ کو سنانے کے بعد اریبؔ نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ ایسی ہی صورتحال ایک دفعہ مخدوم کے ساتھ پیش آئی تھی۔ مخدومؔ نے اپنا کلام سنایا تو سننے والے شاعر نے ایک سقم کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''اس میں ایتا ہے'' مخدومؔ ایتا کے مفہوم سے واقف نہ تھے۔ انہوں نے اسے شاعری

کی خوبی سمجھا اور فوراً جواب دیا ''ہاں ہاں! ایتا ہوتا ہے''۔

اریبؔ کسی جامعہ کے ڈگری یافتہ نہ تھے لیکن علم و ادب کی عالمانہ بصیرت رکھتے تھے۔ زبان و بیان میں الٹ پھیر کے قائل نہ تھے۔ یہاں میں ان سے اپنی گفتگو کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو ۱۹۶۳ء میں ان سے ہوئی تھی۔ اس کا ذکر ''رندِ بدنام سلیمان اریب'' کے عنوان سے چھپے ہوئے مضمون میں ہو چکا ہے۔ اس مضمون کو میں نے ۱۹۶۴ء میں ایک ادبی محفل میں اریبؔ کی موجودگی میں پڑھا تھا۔ اس واقعہ سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ اریبؔ الفاظ کے استعمال میں کتنے محتاط اور کس قدر حساس تھے۔ اقتباس ہے۔

''اکتوبر ۱۹۶۳ء کے نگار (پاکستان) میں لفظ ''بیگانہ'' کے استعمال پر میں نے ایک دلچسپ بحث پڑھی۔ سوال یہ تھا کہ ''بیگانہ'' کو ''بیگانہ وار'' کی جگہ استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ شفیق کاظمی کے ایک شعر پر جس میں ''بیگانہ'' استعمال کیا گیا ہے گلچیں کرنامی نے اعتراض کیا اور جوشؔ ملیسانی، اثرؔ لکھنوی اور ماہرالقادریؔ نے اپنی اپنی رائے دیں۔ اشعار کے حوالے بھی دیے گئے۔ آخر میں نیاز صاحب نے لکھا کہ ''بیگانہ'' ''بیگانہ وار'' کی جگہ تو استعمال نہیں کیا جا سکتا لیکن زیر بحث شعر میں فٹ آتا ہے۔ بحث طویل تھی۔ میں نے اریبؔ سے کہا کہ بوڑھوں کی اس طویل بحث کا کیا حاصل۔ خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ہم نوجوانوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر مفہوم خوبصورتی سے ادا کیا گیا ہے تو بس۔ پھر میں نے کہا ''اریبؔ صاحب اگر کوئی نوجوان ادیب آپ سے یہ بات کہہ دے تو آپ کا کیا ردعمل ہوگا''۔ ''میں تو پہلے اسے ماروں گا'' ایک لمحہ بھی توقف کئے بغیر بڑی گہری سنجیدگی سے اریبؔ نے کہا، پھر وہ گھنٹہ بھر تک بتاتے رہے کہ ہر لفظ کا ایک مزاج ہوتا ہے، اس کی ایک تاریخ ہوتی ہے اور کسی بھی لفظ کے غلط استعمال کا کوئی جواز نہیں۔ بات میں بات پیدا ہوتی رہی اور اس دن کی گفتگو اریبؔ نے فراقؔ کے حوالے پر ختم کی۔ ''آپ میرؔ کی زمین میں شعر کہتے ہیں یا غالبؔ کی۔ اس میں نہ تو میرؔ و غالبؔ کا کچھ بگڑتا ہے اور نہ آپ کا۔ بیچاری شاعری کی مٹی پلید ہوتی ہے۔

''صبا'' نے ۱۹۶۸ء کی اُردو شاعری کا انتخاب شائع کیا تو اس میں اریبؔ کی ایک غزل اور تین چھوٹی نظمیں چھپی ہیں۔ غزل کے چار اشعار ہیں۔

تمہاری قید وفا سے جو چھوٹ جاؤں گا
ازل سے لے کے ابد تک میں ٹوٹ جاؤں گا
خبر نہیں ہے کسی کو بھی خستگی کی مری
مجھے نہ ہاتھ لگاؤ کہ ٹوٹ جاؤں گا
تمہاری میری رفاقت ہے چند قدموں تک
تمہارے پاؤں کا چھالہ ہوں پھوٹ جاؤں گا
ہزار ناز سہی مجھ کو اپنی قسمت پر!
حنائے دست نگاری ہوں چھوٹ جاؤں گا

پہلے شعر کے مصرعہ اولیٰ میں قید وفا کا ذکر ہے تو مصرعہ ثانی میں اس کا موازنہ ازل تا ابد سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح خستگی کا موازنہ ہاتھ لگنے سے' قدموں کا پاؤں کے چھالوں سے اور قسمت کا حنائے دستِ نگاری سے کیا گیا ہے۔ میں نہیں جانتا اس میں کون سے صنائع بدائع استعمال ہوئے ہیں لیکن اس بات کا یقین ہے کہ اریبؔ نے صناعی کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اُن کی شاعری میں الفاظ کے استعمال اور ان کے ربط وضبط سے اشعار کی معنویت بڑھ گئی ہے اور ان کی تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔ پہلی ہی قرات میں یہ غزل قاری کے دل کو چھولیتی ہے۔ جو دو نظمیں عرفان اور ابلاغ کے عنوان سے چھپی ہیں ان میں ہمارے دور کے ایک بڑے عیب کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ یہ کہ ہماری رگوں میں جھوٹ سرایت کر گیا ہے اور گلے میں سچ اٹکا ہوا ہے۔ تیسری نظم کا عنوان ہے ''تم کس سے ملنے آئے ہو''۔ اس کے چند بول ہیں۔

''تم کس سے ملنے آئے ہو/ کس چہرے سے کام ہے تم کو/ اس لبے گورے چہرے سے/ جس پر آگ کے پھول کھلے ہیں/ جو اک سیدھے قد کو سنبھالے/ دل میں

سینکڑوں زخم چھپائے/ اپنی انا کی لاش اٹھائے/ کم ظرفوں کی اس دنیا میں/ اس انساں سے جس کے اندر/ اِک قاتل، زانی، سارق کے/ تینوں چہرے ایک ہوئے ہیں/ اور وہ قاتل اب بزدل ہے/ اور وہ زانی اب شوہر ہے/ اور وہ سارق اب منصف ہے/ تم کس سے ملنے آئے ہو''

اس نظم میں اریبؔ نے اپنی ذات کے بہانے دنیا کے سارے قاتلوں، زانیوں، سارقوں اور کم ظرفوں کو آشکار کیا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو بزدل ہیں، شوہر ہیں اور منصف بنے پھرتے ہیں۔ یہی اریبؔ کی فنی بصیرت ہے۔ سیدھی سادی اور سلیس زبان میں وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ انہیں پڑھ کر ایک قاری محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ تو اس کی اپنی فکر ہے۔

ان کے کلام میں رومانٹک انقلابی شاعری نہیں بلکہ ٹھیٹ انقلابی شاعری کے عناصر ہیں جو عمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ عشق ومحبت سے سرشار کہتے ہیں۔

جو کام ہو نہ سکا کوہکن سے مجنوں سے
وہ کام تیشہ و صحرا بغیر کرنا ہے

اریبؔ نے اپنا سب کچھ صفیہ کو سونپ دیا۔ باقی زندگی اُسی کے اطراف صحرا نوردی کرتے رہے اور عملی طور پر کوہکن اور مجنوں کا کرتب نبھایا۔

میں اریبؔ کی جوانی کے اس دور سے تو واقف نہیں ہوں جو ان کی ازدواجی زندگی سے قبل کا تھا۔ صفیہ سے شادی کے بعد ہی ان سے قریب ہوا۔ ان دنوں میری قربتیں بعض میڈیکل پروفیشن کی خواتین سے تھیں۔ ان میں ایک خاتون کو جب پتہ چلا کہ میں مشاعروں میں جاتا ہوں اور شہر کے ادیبوں اور شاعروں سے میری ملاقاتیں ہیں تو انہوں نے اریبؔ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بارے میں میری رائے جاننا چاہی۔ میں نے اریبؔ کے دو شعر لکھ بھیجے اور فیصلہ ان پر چھوڑ دیا۔

پوچھ مت دیکھ کہ کیا حال اریبؔ آج بھی ہے
اپنے ہی شہر میں بے چارہ غریب آج بھی ہے

دوسرا شعر۔

شکل واعظ کی بنا کر ہی کیوں نہ آئے مگر
رندِ بدنام سلیمان اریبؔ آج بھی ہے

خاتون چپ ہوگئیں۔ اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد پتہ چلا کہ سلیمان اریبؔ نے ویمنس کالج کے ایک تقریری مقابلہ میں صفیہ کی تقریر سے متاثر ہوکر ماہنامہ ''صبا'' کو ان کے نام تاحیات جاری کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد یاد نہیں صفیہ اور اریبؔ سے میری ملاقات کہاں ہوئی۔ کسی سنیما گھر میں؟ کسی کیفے میں یا اس خاتون دوست کے مطب پر جو، اب سب کی مشترک دوست ہوچکی تھیں۔ اسی دوران وجے نگر کالونی میں صفیہ کے نام ہاؤزنگ بورڈ کا ایک مکان الاٹ ہوگیا تھا۔ ان دنوں میرے پاس سیکل تھی۔ جب بھی مجھے وقت ملتا میں چلا جاتا۔ کبھی کبھی ان کے گھر پہنچ رہا ہوتا اور خود اریبؔ اپنے بیٹے حسین کو سیکل پر لیے کہیں جا رہے ہوتے۔ تب میں واپس لوٹ جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ مظہر کاتب اور دوسرے دوستوں کے ساتھ اریبؔ رمی کھیل رہے ہیں۔ میں بھی ان میں شامل ہوجاتا۔ کچھ عرصہ بعد میرے پاس موٹر سیکل آگئی تو میری آمد و رفت بڑھ گئی۔ رمی کھیلنے والوں میں کبھی کبھی اختر حسن صاحب، مغنی تبسم صاحب اور انور معظم صاحب بھی شریک رہتے۔ رمی میں کبھی کوئی فل ہینڈ پکڑا جاتا تو ڈنڈی مارنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اریبؔ کا معاملہ ہمیشہ صاف رہا۔ وہ اپنے تاش کے پتے کھول کر سامنے رکھ دیتے اور ایک ایک پوائنٹ کا حساب دیتے۔ کم و بیش دس سال تک میں نے دیکھا کہ ہر معاملہ میں وہ راست باز رہے۔ کھرے، بے باک، اور ہمدرد، شائستہ اور شرافت کے پیکر۔ اس دوران سرینواس لاہوٹی سے بھی ملاقاتیں ہونے لگیں تھیں۔ آدمی تو وہ بے لاگ تھے لیکن دوستوں کے بارے میں ازراہ تفنن کہانیاں گھڑ لیتے تھے۔ اُن ہی جیسے اصحاب کے بارے میں مثل صادق آتی ہے کہ افواہیں

پھیلتی بعد میں ہیں، پہلے وہ ایجاد ہوتی ہیں۔ چند افواہیں میں نے اریبؔ کے بارے میں ان سے سن رکھی تھیں۔ آخری دنوں ان میں بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ اب وہ رہے نہ اُن کے وہ ملاقاتی، جن کے بارے میں خوش گپیاں ہوتیں۔ عوض سعید بھی اپنے دوستوں کی ٹانگ کھینچنے میں ماہر تھے۔ وہ یہ کام اس شائستگی سے کرتے کہ پڑھنے والوں کو برا نہیں لگتا لیکن جس کے بارے میں رقم کرتے وہ محسوس کرلیتا۔ عوض سعید کا مقصد بھی شاید یہی ہوتا۔ اریبؔ کے بارے میں وہ ایسا کچھ نہ کرسکتے تھے بلکہ ایک خیال اس طرح کا پیش کیا کہ دوست ہو یا دشمن اُس سے اختلاف نہیں کرسکتا۔

انہوں نے لکھا اریبؔ اگر چاہتا تو کسی نواب زادے کا شریک بزم ہوسکتا تھا لیکن وہ ''خود اپنی انا کے بل بوتے اپنا ہی لہو زندگی بھر پیتا رہا''۔

اب میں چند برسوں کے واقعات سے صرف نظر کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہوں اور اس دور میں پہنچتا ہوں جہاں اریبؔ پر آشکار ہوا کہ وہ کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہوگئے۔ اپریل 1969ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔ چند دن حیدرآباد میں علاج ہوا، پھر وہ دلی اور بمبئی ہو آئے۔

ممبئی سے واپسی پر میں اُن کے گھر گیا۔ وہ نیم برہنہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گردن اور سینہ پر کچھ ایسے نشان تھے جو بدشگونی کا منظر پیش کر رہے تھے۔ گمان میں نہ تھا کہ اس قدر جلد یہ موذی مرض اریبؔ پر تسلط پائے گا۔ میں دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ صفیہ بھی پاس ہی بیٹھی تھیں۔ تینوں خاموش تھے۔ بات کرنے کے لئے کوئی موضوع نہ تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اریبؔ سے آرام کرنے کو کہا اور گھر چلا آیا۔ اس کے چند دن بعد ہی اریبؔ اور صفیہ بنگلور گئے۔ مشاعرہ تھا یا محمود ایاز سے ملاقات کا مقصد۔ اتنا جانتا ہوں کہ واپسی میں مخدومؔ محی الدین اور مغنی تبسم بھی ساتھ تھے۔ اس کے بعد ہی اریبؔ مہدی نواز جنگ کینسر ہاسپٹل میں شریک ہوگئے۔ مغنی تبسم، انور معظم اور میں ان احباب میں تھے جو اکثر عیادت کیلئے کینسر ہاسپٹل جایا کرتے۔ دیگر احباب بھی تھے مگر میری ملاقات اکثر ان ہی دونوں سے ہوا کرتی۔ ایک دن میں اکیلا ہی پہنچا تھا۔ اریبؔ نے یہ کہہ کر کہ نظم ابھی تخلیق ہوئی ہے، ''کڑوی خوشبو'' میرے سامنے رکھی۔ نظم کا آخری بند تھا۔

زندگی آج یہ معلوم ہوا
کچھ بھی نہیں
چھپکلی بھی نہیں
ہاں مگر اس کی کٹی دم ہوگی

اریبؔ کے پاس زندگی حقیر تھی تو اس سے زیادہ حقیر موت تھی اس لئے کہ وہ زندگی کو چوس لیتی ہے۔ اُن کے پاس کشمکش حیات کی اہمیت تھی۔ اسی لیے انہوں نے کچھ ایسے شعر کہے کہ اپنی ذات کے توسط سے فرد کو بڑائی کا احساس دلایا۔

ہمارے دم سے ہے قائم روایت مستی
جو ہم نہ جائیں سوئے میکدہ اٹھے نہ گھٹا

حیات کا حوصلہ دلانے والا شخص اڑتالیس (۴۸) سال کی عمر میں موت سے ہاتھ ملاتا ہے تو وہ خوف کا اظہار نہیں کرتا بلکہ حقیقت حال بیان کرتا ہے۔

زہر کی لہر ہے یا موت کی کڑوی خوشبو
لحہ لحہ میرے جی جاں سے گزر جاتی ہے
پاتھڈن لینے سے کچھ دیر کو نیند آتی ہے

اسی کشمکش حیات نے انہیں حریف مئے مرد افگن عشق کا خطاب دیا۔ یہ خطاب سوائے اریبؔ کے کسی اور پر صادق نہیں آتا۔

میں جب یہ آخری نظم پڑھ رہا تھا، باہر بارش کی ہلکی ہلکی پھوار تھی اور مٹی میں سوندھی سی خوشبو۔ کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے اریبؔ کی توجہ اس طرف دلانی چاہی۔ انہوں نے کہا "بارش ہو یا کچھ اور اب کچھ ہونے والا نہیں ہے"۔ عیادت کے لئے آنے والوں سے اریبؔ نے ہمیشہ مسکرا کر حوصلے کی بات کی، لیکن اب تو دل کی مریض ہو کر صفیہ بازو ہی دوسری پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ دو تین دن بعد میں پھر کینسر ہاسپٹل گیا تو قلب پر ایک اور حملہ کی وجہ صفیہ گاندھی

ہاسپٹل سکندرآباد منتقل ہو چکی تھیں۔ جیسے ہی میں وہاں پہنچا اریبؔ نے میرے ہاتھ میں ایک پرچی پکڑا دی۔ ''حسین کا ایکسیڈنٹ ہو کر ہاتھ میں فریکچر آیا ہے۔ اس فون کو ملا کر پتہ کیجئے کہ صورتحال کیا ہے''۔ میں ٹیلیفون کے مقام تک پہنچا ہی تھا کہ اریب سیڑھیاں اتر کر آتے ہوئے دکھائی دئے۔ اللہ اللہ کیا ہمت پائی ہے۔ وہ طاقت کہاں سے آگئی کہ جسم کا ایک ایک عضو درد میں مبتلا ہے اور یہ آدمی سیڑھیاں اتر کر آ رہا ہے۔ اس کے بعد دو تین دن مزید گزرے ہی تھے کہ اریب کے وارڈ میں میری ملاقات مغنی صاحب سے ہوئی۔ باہر نکلکر ہم لوگوں نے سرگوشی کی اور کہا کہ اس سانحہ کی اطلاع جس کو پہلے ہوگی وہ دوسرے کو خبر پہنچادے گا۔ ایک دن بیچ میں گزرا۔ دوسری صبح مغنی صاحب کا فون آیا کہ اریبؔ اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ ۸ ستمبر ۱۹۷۰ء کی صبح تھی۔ رات میں انتقال ہو چکا تھا۔ صفیہ دیدار کے لئے آنا چاہتی تھیں۔ ڈاکٹروں نے اجازت نہیں دی۔ جنازہ مسجد پہنچا۔ دوست احباب جو گھر تک نہ آسکے تھے وہ مسجد پہنچ گئے۔ حاضرین نے میت کو کندھا دیا۔ جنازہ سیف آباد قبرستان پہنچا۔ دیکھتے دیکھتے اریبؔ کا جسم زمین اور کائنات کی گہرائیوں میں پنہاں ہو گیا۔ قبرستان سے لوٹتے ہوئے اہل میت نے دیکھا کہ حسین زار و قطار رو رہا ہے۔ اریبؔ نے کبھی کہا تھا۔

میں کھو گیا بھی تو کیا : تیرگیٔ شب میں اریبؔ
مرا حسینؔ مرا آفتاب باقی ہے

یہ سچ ہے کہ اریبؔ کا تخلیق کیا ہوا ''انسان نہیں مر سکتا''۔

ڈسمبر ۲۰۰۸ء

***

عزیز آرٹسٹ

کسی شخص کا اپنے عزیز واقارب اور دوست احباب میں محبوب ومقبول ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی کوئی اپنے (Nick Name) نِک نیم سے بھی مقبول ہوجاتا ہے۔ یہ نک نیم ہی اس کی مقبولیت کی پہچان بن سکتا ہے لیکن جب کسی کے نام کے ساتھ کسی صفت کا استعمال ہونے لگے تو پھر ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ یہ صفت اُس کے نام کا جُز کیسے بنی؟ عزیز الدین کو میں لگ بھگ 35 برسوں سے جانتا ہوں، صرف عزیز آرٹسٹ کے نام سے۔ کئی برسوں بعد معلوم ہوا کہ ان کا پورا نام محمد عزیز الدین ہے۔ ان کے بہت سے چاہنے والے اور وہ جو انہیں برسوں سے جانتے ہیں وہ بھی عزیز آرٹسٹ کے نام ہی سے واقف ہیں جیسے نام رکھائی کے وقت یہی نام اُن کے ماں باپ نے تجویز کیا تھا۔ ورنہ آپ بڑے سے بڑے آرٹسٹ کے نام کے آگے پیچھے چند القاب پائیں گے۔ نام جاننے کے بعد مزید اُس کے کام یا پیشہ کے بارے میں سوالات کئے جاتے ہیں تب یقین ہوتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جو ہماری گفتگو کا موضوع ہے۔ لیکن عزیز اس طرح کے سوالات سے بے نیاز ہے۔ اُس کے نام کے ساتھ ہی آرٹسٹ لگا ہوا ہے۔ عجیب بات ہے کہ پرنٹ میڈیا نے انہیں وہ شہرت نہیں بخشی جو بعض دوسروں کو دی۔ اس کا بڑا سبب خود عزیز کا رویہ ہے۔ وہ پرنٹ اور پبلسٹی میڈیا کے ارباب سے کتراتے رہے، اُن سے دور بھاگتے اور اُن کی نفی کرتے رہے۔ عزیز کی پینٹنگس کی نمائش کے کئی ایسے مواقع آئے جہاں میڈیا کے ارباب نے ایک سے زائد بار اُن سے انٹرویو کی درخواست کی لیکن جب ایک بار "نا" کردیا تو وہ اسی "نا" پر قائم رہے۔ بہت ہی کم ایسے

مواقع رہے ہوں گے کہ نمائش گاہ میں کئی دیگر معروف وغیر معروف آرٹسٹوں کے کام کی نمائش ہوئی اور ہر آرٹسٹ کو کچھ نہ کچھ کہنا پڑا تو عزیز چھٹکارا نہ پاسکے۔ یہاں تک کہ آرٹ کریٹک کی شہرت رکھنے والوں سے بھی کسی قسم کی راہ ورسم نہ رکھی بلکہ حتی الامکان اُن سے دور رہنے کی کوشش کی۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے ذی اثر اور صاحب اقتدار اصحاب سے ملنے سے گریز کیا۔ ابھی جب کہ میں یہ مضمون قلمبند کررہا ہوں، وہ گذشتہ چار پانچ ہفتوں سے ٹاملناڈو گورنر برنالا کے مہمان کی حیثیت سے پریسیڈنٹ پیالیس چینائی میں مقیم ہیں۔ گورنر صاحب سے گذشتہ کئی برسوں سے شخصی روابط اس کا سبب ہے۔ وہ چاہتے تو کئی مرکزی اور ریاستی وزراء سے راہ ورسم بڑھا سکتے تھے لیکن وہ تو گورنر پیلیس میں ڈائننگ ہال میں اس لئے نہیں جاتے کہ وہاں وی آئی پی اور صاحب اقتدار حضرات سے ملاقات ہوا کرے گی اور غیر ضروری اُن سے گفت وشنید کے مواقع پیدا ہوں گے کیونکہ فنون لطیفہ پر یا عوامی زندگی کے مسائل پر ان حضرات اور عزیز کے خیالات میں کوئی تال میل نہیں۔ گپ شپ بھی کرنا ہو تو انہوں نے غیر دانستہ پکاسو کا رویہ اپنایا کہ وہ اپنے بچپن اور جوانی کے دوستوں کے ساتھ وقت گذارنا پسند کرتا تھا۔ یہ ایسے دوست تھے جو کاریگر یا مزدور پیشہ تھے۔ عزیز بھی اپنے انہیں دوستوں میں مگن رہتے ہیں جنہیں وہ چاہتے ہیں۔ اس کا اثر یقیناً یہ ہوا کہ اخباروں، جریدوں یا ماس میڈیا میں عزیز کا نام اس طرح نہیں لیا گیا جس طرح بعض کم درجہ کے آرٹسٹوں کا لیا گیا۔ تاہم میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ عزیز کو میڈیا کی مدد کے بغیر جو مقبولیت اور ہمہ گیر شہرت ان کی پینٹنگس کی بدولت حاصل ہوئی کسی دوسرے آرٹسٹ کے حصہ میں نہیں آئی۔

ایک موقع پر کسی صحافی نے عزیز سے پوچھا "جناب یہ بتایئے کہ پینٹنگس آپ کا پروفیشن (پیشہ) ہے یا پیشن (Passion) یعنی جذباتی لگاؤ۔ عزیز نے جواب دیا "ہاں جناب ابتداء میں تو پیشن ہی تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ پروفیشن بن گیا"۔ اس طرح عزیز کا یہ عمل ژاں پال سارتر کی فکر کے عین مطابق ہے کہ ایک آرٹسٹ کو جو کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے وہ اپنے پیشہ کی ہنرمندی سے حاصل کرے۔ اس کے علاوہ کسی اور ذریعہ (انعامات یا پبلسٹی) سے حاصل کرنے کی کوشش اس کی

بددیانتی ہوگی۔

مبالغہ آمیزی کے عیب سے بچتے ہوئے میں کہوں گا کہ گذشتہ تیس پینتیس برسوں میں عزیز آرٹسٹ کی ڈیڑھ تا دو ہزار پینٹنگس ہاتھوں ہاتھ چلی گئیں۔ کتنی ہی ایسی پینٹنگس اُن میں شامل ہیں جو تحفہ میں دی گئیں۔ ان کی پینٹنگس کو تحفہ میں حاصل کرنے کا میں بھی گنہگار ہوں۔ ایک تو سولی پر چڑھائے گئے حضرت عیسیٰ کی پینٹنگ ہے جو روزری کانونٹ اسکول میں ایک دوست کی لڑکی کو داخلہ دلوانے کے لئے دی گئی۔ ایک دوسری مدراس میں ہوئی دوست کے ایک لڑکے کی شادی میں تحفہ دی گئی گھوڑوں کی واٹرکلر پینٹنگ ہے جو اس وقت نیویارک میں ہے۔ کوئی ہندوستانی ایسا نہیں جس نے اس پینٹنگ کو نہ دیکھا ہو اور گرویدہ نہ ہوا ہو اور اسے اپنی ملکیت بنانے کی خواہش نہ کی ہو۔ عزیز کے پینٹنگ بنانے کی کسی کو اطلاع ہو اور اس اطلاع پر فوراً وہ آرٹسٹ کے اسٹوڈیو اسے حاصل کرنے کے لئے پہنچ جائے یا دیکھنے کے لئے ہی سہی تو تب تک وہ یا تو فروخت ہو چکی ہوتی یا پھر کسی کو تحفہ میں نذر کردی گئی ہوتی۔ ہندوستان کے کسی بھی بڑے شہر میں جہاں جہاں میرا جانا ہوا، ممبئی، بنگلور، تریویندرم، دہلی، چینائی، سری نگر، شملہ، علی گڑھ، ہر جگہ میں نے اپنے دوستوں کے گھروں میں اور وہاں کی کسی نہ کسی بڑی ہوٹل میں عزیز کی پینٹنگ دیکھی۔ ہندوستان سے باہر ٹورنٹو، شکاگو، کیلی فورنیا اور لندن میں بھی ان کی پینٹنگس نظر آئیں۔ البتہ قازقستان اور اٹلی کے شہر ایسے ہیں جن کے بارے میں کوئی وسیلہ میرے پاس ایسا نہیں تھا کہ وہاں کے سارے پبلک مقامات دیکھ سکتا یا کوئی دوست ہوتا جس کے گھر میں جھانک سکتا۔ اگر کسی دوست کے گھر میں عزیز کی پینٹنگ دکھائی نہ دے تو سمجھئے کہ کسی اور دوست نے اس کے پاس سے اسے حاصل کرلیا ہوگا۔ عزیز کی دو پینٹنگس جو میرے پاس تھیں میرے دوستوں نے لے لیں، مشکل سے یہ چند ماہ میرے پاس رہ سکیں۔ کئی برسوں سے اس طرح کا نیک سلوک عزیز کی پینٹنگس کے ساتھ جاری ہے۔ ان میں بعض نایاب پینٹنگس بھی رہی ہیں۔ کبھی کبھی شائقین نے ان کی دوگنی تگنی قیمت کا پیشکش کیا لیکن پینٹنگ واپس

نہ آسکی۔ انہیں دوبارہ دیکھنے کی خواہش بھی پوری نہ ہوسکی۔ ایک تصویر دلی میں دیکھی تھی۔ بیس پچیس فٹ کے کینوس پر ایک وسیع جھیل ہے۔ ٹھہرا ہوا پانی، پہلو میں ایک پگڈنڈی ہے جو ایک ایسی عمارت کی طرف جاتی ہے جس کی مضبوط دیواروں سے کہیں کہیں پتھر نکلے ہوئے ہیں۔ نہایت ہی دلکش روحانی منظر ہے جس میں کھوجانے کو جی چاہتا ہے۔ ایک دوسری تصویر گوتم بدھ کی تھی۔ اپنے شیرخوار بچے کو جھولے میں سوتا چھوڑ کر بدھا اپنے محل سے روانہ ہو رہے ہیں۔ نہ بیٹے کی چاہت اور نہ ہی محل کی اونچی اونچی دیواریں بدھا کے راستے کی رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ ایک فکر انگیز لمحہ ناظرین پر طاری ہوجاتا ہے۔ ایک تیسری تصویر کا ذکر کرتا ہوں۔ دیہات کی ایک بنجارن سجی سجائی اپنے روایتی لباس اور گہنوں میں بیٹھی راہ تک رہی ہے۔ تھوڑے سے فاصلے پر ایک کنواں ہے جس میں ڈول لٹکا ہوا ہے۔ پاس میں ایک بکری کھڑی ہے اور وہ پیاسی ہے۔ پینٹنگ دلکش ہی نہیں بلکہ اسے دیکھ کر بہ یک وقت حسرت ویاس، امید وبیم کے احساسات دل و دماغ میں ہلچل پیدا ہوجائیں۔ فی الوقت میں ان تینوں پینٹنگوں کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ ہوٹلوں اور کلبوں میں بنائے ہوئے پینتالیس، پچاس فٹ کے چند ایسے میورل بھی ہیں جن کا کوئی ثانی نہیں۔ تاج ریسیڈنسی، کنٹری کلب، ٹریژری آئی لینڈ کے علاوہ ملٹری اور پولیس کے کئی ایسے ہال ہیں جہاں عزیز آرٹسٹ کی پینٹنگ آویزاں ہیں۔ قارئین میں کئی ایسے احباب ہوسکتے ہیں جو اس سے بہتر نقشہ پیش کرسکیں۔

اپنی پینٹنگس کے ساتھ عزیز آرٹسٹ کی بے التفاتی اُن کی کسرِ نفسی کے علاوہ ان کی کسی نفسیاتی الجھن کا سبب بھی لگتی ہے۔ برسوں کی رفاقت کے بعد بھی میں اس گرہ کو کھول نہ پایا۔ میرا یہ مشاہدہ عزیز کی پینٹنگس کے بارے میں ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی میں جو بے راہ روی دیکھی ہے اس کے بارے میں بھی ہے۔ بعض وقت وہ بڑے منظم اور دانا لگتے ہیں لیکن بعض دیگر اوقات وہ بڑے ناسمجھ اور نادان بھی لگتے ہیں۔ ناسمجھی اور آوارہ گردی کسی بھی آرٹسٹ کی پہچان ہوسکتی ہے لیکن عزیز کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ذات میں یہ صفات بڑی مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ یا یہ

کہ شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کسی دن عزیز کے اسٹوڈیو چلے جائیے، آپ کو ایک بھی پینٹنگ دکھائی نہ دے گی۔ کسی ایزل یا فریم پر چند کینویس ٹنگے ہوئے نظر آئیں گے۔ جو پینٹنگ ادھوری رہ گئی ہے وہ دنوں تک ادھوری پڑی رہے گی۔ اگر مکمل ہوگئی تو کسی کے ہاتھ چڑھ جائے گی۔ دس، بیس، پچیس، پچاس ہزار یا لاکھ ڈیڑھ لاکھ میں بک گئی ہوگی۔ اس کے دوسرے ہی دن عزیز پھر خالی ہاتھ ہوگا اور اگر کچھ رقم پتلون کی جیب میں پڑی ہے تو اسے خالی کرنے کی عزیز کو جلد سے جلد فکر لاحق ہوگی۔ یا تو دوستوں کی دعوت کی یا پھر کسی حاجت مند کی ضرورت پوری کردی۔

جب عزیز سے پوچھا جاتا ہے کہ اچھی خاصی رقم حاصل ہونے کے باوجود وہ پل دو پل میں قلاش کیوں ہوگیا تو وہ ایک بے معنی سا قہقہہ لگا کر خاموش ہوجائے گا، کسی دوست نے اصرار کیا تو جواب دے گا "بتائیے کیا میں کل زندہ رہوں گا" اس طرح دوشاخہ (Dichotomy) عمل کی گتھی بھی میں سلجھا نہ سکا۔ انہیں مزید کریدئے تو وہ یہی کہیں گے کہ اس طرح کی زندگی ہر شخص کو برتنا چاہئے۔ کمٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ آپ آج، بلکہ شاید اسی لمحہ زندہ ہیں۔ کیا کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ وہ جب بھی گہری نیند سوتے ہیں تو اس بات پر غور کریں کہ کیا یہ گہری نیند موت کے مماثل نہیں۔ اگر جاگ گئے تو آپ جی رہے ہیں، موت کا تصور اس گہری نیند ہی کے مماثل ہوسکتا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ہم گہری نیند سے بیدار ہوجاتے ہیں۔ جاگنے کے بعد ہمارا عمل کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ کچھ کریں، کچھ کمائیں، کھائیں، نام پیدا کریں اور پھر سے گہری نیند سو جائیں۔ عزیز ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ مزید وہ چاہتے ہیں کہ ہم اس طرح کی گہری نیند اور موت کے تصور میں ایک ربط پیدا کریں تاکہ ہمارا رویہ دوسرے انسانوں اور دیگر مخلوقات کے ساتھ انصاف پر مبنی ہو اور ہمدردانہ رہے۔ لیکن بعض وقت اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لیے وہ ایسی بے رحمی برتتے ہیں کہ اُس کا راست اثر تو گھر والوں پر پڑتا ہی ہے دوست احباب بھی اس کی مار میں آتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں گہری نیند اور موت کے بارے میں عزیز سے میں نے دوبارہ سُنا تو

مجھے تین دہے قبل کا وہ دور یاد آگیا جب عزیز سلطان شاہی میں رہا کرتے تھے۔ غربت میں ہو کہ فراغت میں زندگی کے ساتھ ان کا سلوک ایک ہی طرح کا رہا۔ عزیز کی رفیق حیات بیگم شاہدہ بھی ان کے سرد وگرم، غربت وفراوانی، صحت و بیماری، ہر پل ان کے ساتھ رہیں۔ ان دنوں ان کے دو شیر خوار بچے تھے۔ اب تو ماشاء اللہ سے سات جوان، توانا اور خوبرو لڑکے ہیں۔ ساتوں اپنے اپنے ہنر میں ماہر، ماں باپ اور عزیز و اقارب کے چہیتے...... ان دنوں عزیز یورپ گئے ہوئے تھے اور شاید وہاں کسی ہم پیشہ کے دکھ درد میں شریک تھے اور اب بھی وہ کئی کئی مہینے وطن سے باہر رہتے ہیں اور حاجت مندوں کے دکھ درد کا مداوا کرتے ہیں۔ بیگم شاہدہ اسے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرلیتی ہیں۔ دراصل صبر وتحمل اور ایثار انہیں فطرت سے ودیعت ہے۔ مزید انہوں نے اپنی چالیس سالہ ازدواجی زندگی میں اس صفت کو جلا بخشی ہے۔ عزیز یوروپ سے چند ماہ بعد خالی ہاتھ لوٹے۔ دو چار دن سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ چند پینٹنگس تیار ہوگئیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئیں۔ گھر کے کاروبار معمول کے مطابق چلنے لگے۔ عزیز پر جب کام کرنے کا بھوت سوار ہوتا ہے تو رات دن مشین کی طرح کام کرنے لگ جاتے ہیں، نہ چاہیں تو کئی کئی دن کام کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ اب تو انہوں نے بنجارا ہلز پر آصفجاہی اپارٹمنٹ میں ایک وسیع فلیٹ اپنے اسٹوڈیو کے لئے لے رکھا ہے۔ کبھی تو اس پر تالا پڑا رہتا ہے اور دنوں ہفتوں نہیں کھلتا اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ اسٹوڈیو کے اندر سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ جی چاہا تو کسی دوست کو ٹیلیفون کرلیں گے لیکن کوئی دوست اگر انہیں ٹیلیفون کرے تو اکثر ان کا سل آف رہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان ہی کی ایما پر ان کے دوست ان سے مل سکتے ہیں۔ گذشتہ پندرہ دن سے تو وہ چینائی میں گورنر تاملناڈو کے مہمان ہیں۔ ان تک رسائی ممکن ہی نہیں۔ گھر والوں اور کبھی کبھی دوستوں کی خوش نصیبی کہ عزیز کو کبھی اپنے فارم ہاؤز (معین آباد سے آگے) جانے کی دھن سوار رہتی ہے۔ اکثر وہ اکیلے ہی چلے جاتے ہیں۔ ڈرائیور انہیں وہاں چھوڑ کر گھر واپس ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھی مجھ جیسے دوستوں کی بن آتی ہے تو ساتھ

لے لیتے ہیں۔ بڑی خاطر ومدارت کرتے ہیں۔ کھلی فضا میں زندگی کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ دوست اپنی جیب سے پیسہ خرچ کرنا چاہتے ہیں تو عزیز اس کا موقع نہیں دیتے۔ ''آج...... آج تو میرے پاس پیسے ہیں''۔ یہ ''آج'' مشکل ہی سے ''کل'' پر جاسکتا ہے۔ ایسے مواقع بار بار آئیں تو دوستوں کو تو بڑی شرمندگی محسوس ہوتی ہے لیکن عزیز کی ''ہاں'' ہو کہ ''نا'' اس میں بڑی شدت ہوتی ہے۔ ضد اُن کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ یہی سبب ہوگا کہ معین آباد کا یہ فارم ہاؤز جو پندرہ سال قبل ساڑھے چار ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا اب سکڑ کر ڈیڑھ ایکڑ پر رہ گیا ہے۔ عزیز کو اس کی فکر نہیں کہ یہ فارم وہ اپنی اولاد کے لئے چھوڑتے ہیں کہ نہیں۔ وہ تو توکل کے عادی ہیں۔ ہر آنے والی نسل کا نگہبان مستقبل ہے۔ ہر شخص اپنی محنت کی کمائی کھائے گا۔ یہی وصف انسان کو خوش وخرم رکھ سکتا ہے۔ ورنہ دولت اور ہوس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ صفت انہیں ورثہ میں ملی ہے۔

عزیز کی شادی ہوئی تھی، ان کی بیگم شاہدہ ایک اسکول ٹیچر تھیں، ان کی تنخواہ کے علاوہ عزیز کو پینٹنگس سے بھی کچھ پیسے مل جاتے تھے۔ گاؤں میں ان کے ابّا کے نام پر کھیت اور زمین بھی تھی۔ ابّا کی بہنیں اور سوتیلے بھائی بھی تھے۔ ایک دن ابّا عزیز کے گھر آئے تو انہیں معاشی طور پر مطمئن دیکھا اور کہا کہ کھیت اور زمین ان لوگوں کے نام کردیں گے جن کے پاس کوئی اثاثہ نہیں ہے اور نہ کوئی آمدنی۔ محنت کرکے جیتے ہیں۔ عزیز تو یہی چاہتے تھے، باپ کے اس ارادہ پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ یہ احباب وقتاً فوقتاً ابّا کے گھر آیا کرتے تھے۔ کھیت ان کے نام ہوگئے تو آنا جانا بھی بند ہوگیا۔ ابا کو کوئی شکایت نہ تھی تو عزیز کو کیسے ہوتی۔ ہاں تو عزیز کے فارم کی بات ہو رہی تھی، انہوں نے جب فارم خریدا تھا تو اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دوسروں کے کھیتوں کے درمیان سے ہوکر جانا پڑتا تھا۔ اب جب کہ چاروں طرف فارم ہاؤز بن گئے ہیں ایک چھوٹا سا راستہ عزیز کے فارم تک بن گیا ہے۔ اس چھوٹے سے فارم کے لئے چھوٹے راستہ میں ہی عافیت ہے۔ عزیز کا کہنا ہے کہ اتفاق سے ایک ہنر ہاتھ آگیا ہے ورنہ زندگی کو کسی بھی ڈھب

سے گذارا جاسکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ آدمی اپنی طرح سے اور اپنی مرضی سے جئے۔ یہی وجہ ہے کہ عزیز نے نہ تو اپنے کسی دوست کو کبھی کوئی مشورہ دیا اور نہ ہی کسی کا مشورہ قبول کیا۔ اسی فارم ہاؤز کے ابتدائی دور کا ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ ایک دن عزیز کو ان کی پینٹنگ پر خاصی رقم ملی تھی۔ انہیں فوراً اپنے فارم پر جاپانی طرز کا پگوڑا بنانے کی سوجھی۔ اینٹ، سمنٹ، لکڑی اور انگریزی کویلو حسب ضرورت خرید لی اور دیکھتے ہی دیکھتے کوئی پانچ، چھ سو مربع فٹ کا ہال چاروں طرف ورانڈے کے ساتھ تعمیر ہوگیا۔ چھت کے اوپری حصہ کو مسطح رکھ کر وہاں کوئی سو فیٹ کا ایک اور کمرہ بنادیا۔ اس تک پہنچنے کے لئے زمین کی سطح سے بڑے ہال کی چھت تک اور پھر وہاں سے اوپر کے کمرے تک پہنچنے کیلئے سیڑھیاں بنوادیں۔ گھر بھرائی کی دعوت کے لئے عزیز کو کسی بہانے کی ضرورت نہیں لیکن یہ موقع بہت مناسب تھا۔ چند احباب جمع ہوئے، بعض نے چند سیڑھیاں چڑھ کر لوٹ آنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ میرے علاوہ ایک اور دوست نے بھی ہمت کی۔ باری باری ہم لوگ اوپر کے کمرے تک گئے۔ چند منٹ میں اس خوف سے واپس ہوگئے کہ چھت سمیت ہمیں زمین پر واپس آنا نہ پڑے۔ سنا ہے کہ عزیز بھی کبھی کبھی اس کمرے تک اکیلے جایا کرتے اور وہاں گوتم بدھ کی طرح الکت پلکت مار کر بیٹھ جاتے اور یوگا کے آسن کرتے، لیکن یہ پگوڑا زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکا۔ مکینوں کی خوش نصیبی کہ تیز ہوائیں اس وقت نہیں چلیں جب لوگ چھت کے نیچے آرام کررہے تھے۔ ایک ہلکی سے طوفانی ہوا آئی اور پگوڑا چھت سمیت زمین پر آرہا۔ اس وقت کوئی ڈیڑھ دو لاکھ کا صرفہ اس کی تعمیر میں لگا ہوگا۔ اس رقم میں ان بیس پچیس ہزار روپیوں کو مزید شامل کرلیجئے جو اس مزدور کے علاج پر صرف ہوئے جو کام پر آنے کے پہلے ہی دن بے ہوش ہوگیا تھا۔ عزیز کو دکھ اس بات کا تھا کہ ایک بیمار مزدور کو اُجرت کی خاطر کام کرنا پڑا تھا۔ اب اس فارم ہاؤز میں ایک مختصر سا ہال، دو کمروں اور بیت الخلاء کے ساتھ تعمیر کرایا گیا ہے۔ معمول کے مطابق عزیز ایک دن فارم گئے اور اس ہال کی چھت پر رات اور دن چوبیس گھنٹے پڑے رہے۔ فارم کی نگرانی کرنے والے نے

ان کی بھی دیکھ بھال کی۔

ممکن ہے کہ اس سوانح میں بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بیان کی گئی ہوں لیکن میں سوچتا ہوں کہ ہماری طرح معاشی اور سماجی سطح پر جینے والوں کی اکثریت کچھ اسی طرح کے حالات زندگی سے گذرتی ہے۔ عزیز آرٹسٹ کی پینٹنگس کی بعض نمائشوں کی روئیداد میں نے گذشتہ برسوں میں لکھی ہے، ان کے بعض سوانحی واقعات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک روشن پہلو جس کا ذکر اس سوانح میں ضروری ہے وہ ان کا مطالعہ ہے۔ ابتدائی دور میں انہوں نے اردو اور دیگر زبانوں کے لٹریچر کا اچھا خاصہ مطالعہ کیا ہے۔ مغرب اور مشرق کے آرٹسٹوں کی زندگی اور ان کے کارناموں سے بھی خوب واقف ہیں۔ میوزک سے بھی انہیں گونا لگاؤ ہے۔ راگوں اور سروں کے فرق کو جانتے ہیں۔ ایک زمانے میں بانسری بجانے کا ریاض کرتے رہے۔ چند دن قبل میں نے ان سے پوچھا تھا کہ کس طرح کی پینٹنگس بنارہے ہیں، کہا کہ جنوبی ہند کے لینڈ اسکیپ کے علاوہ ایک پینٹنگ فور سیزن (چار موسم) پر بنائی ہے۔ اس پر میں نے اپنی بڑائی جتانا چاہی کہ میرے پاس فور سیزن کا ایک کیسٹ ہے۔ ''جی ہاں! وہ ویوالدی (Antonio Vivaldi) کا کیسٹ ہوگا''۔ عزیز نے فوراً حامی بھری اور اس طرح فنون لطیفہ کا ذکر کرتے ہوئے میں ان سے پھر ایک بار مات کھا گیا۔ ویوالدی کے نام سے میں واقف نہیں تھا۔ کائنات کے ارتقاع اور انقلابات کے رہنماؤں کا بھی وہ خاصہ درک رکھتے ہیں۔ چے گوارا کا نام جس کا 80واں یوم پیدائش ان دنوں ساری دنیا میں منایا جارہا ہے، پہلی بار میں نے آج سے پچیس سال قبل کسی اور سے نہیں بلکہ عزیز ہی کی زبانی سنا تھا۔

لٹریچر میں عزیز نے اُردو کے ناول اور افسانے بھی بہت پڑھے ہیں۔ روسی اور انگریزی فکشن کے ترجمے جو انہیں اردو میں دستیاب ہوسکے، انہیں بھی پڑھا ہے۔ خاکوں اور انشائیوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ ایک بار مزاح نگاروں کے بارے میں بڑا دلچسپ انکشاف کیا۔ کہنے لگے کہ ان حضرات میں بعض کی حس مزاح ٹھیک ٹھاک ہی ہے لیکن کبھی کبھی یہ حضرات اپنی خاکہ نگاری یا کالم

نگاری میں لطیفے گھڑ لیتے ہیں۔ تخیل کا کال پڑ جاتا ہے تو ادیب، اور شعبدہ باز کا فرق ابھر کر آتا ہے۔ پھر وہ ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو ان کی لطیفہ گوئی پر واہ واہ کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسی حصار کے رطب اللساں ہوتے ہیں جو ان مزاح نگاروں نے اپنے اطراف کھینچا ہوتا ہے۔ ان احباب کی کثرت میں سنجیدہ ادیب اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کا حال وہی ہوتا ہے جو کوؤں کی کائیں کائیں میں طوطی کی بولی کا ہوتا ہے۔

عزیز کی دوستیاں، ان کی طالب علمی کے دور ہی سے چند معروف ادیبوں سے رہی ہیں۔ حیدرآباد میں احمد ہمیش، نرل جی، راجہ دوبے اور سلیمان اریب، بعد میں سید عالم خوندمیری، اختر حسن، مغنی تبسم، سید سراج الدین اور آئزک سیکوئرا جیسے عالموں کی بھی قربتیں انہیں حاصل ہوئیں۔ مشہور آرٹسٹ اور پورٹریٹ کے ماہر سعید بن محمد تو عزیز کے استاد تھے اور عزیز ان کے چہیتے شاگرد۔ عزیز جن آرٹسٹ فنکاروں کے مداح رہے ہیں ان میں بھوشن صاحب اور رحیم صاحب بھی تھے۔ آخری الذکر اپنی طبعی عمر کو پہنچنے سے قبل ہی گذر گئے۔ ممبئی میں جن حضرات سے ملاقاتیں اور رسم و راہ رہی ان میں ظ۔ انصاری، باقر مہدی اور کیفی اعظمی کے نام خاص طور پر لئے جاسکتے ہیں۔ اشوک کمار نے تو عزیز سے بعض پینٹنگس بنوا کر اپنے نام کا ٹھپہ لگادیا۔ پاکستان میں عزیز کی پینٹنگس کی نمائش ہوئی تو اس میں مشتاق احمد یوسفی، جمیل جالبی، انور سجاد اور پروین شاکر جیسے ادیبوں سے ملاقاتیں رہیں۔ انور سجاد ممبئی کے زمانے سے ہی عزیز سے واقف تھے۔

مرحوم انور رشید جن پر مختصر مضمون اس کتاب میں شامل ہے، عزیز کے ہم عمر اور جوانی کے قریب ترین دوست تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں دونوں سیکل پر پیڈل مارتے ہوئے بنجارہ ہلز (راک کیسل) جایا کرتے۔ یہاں ایک آئی اے ایس خاتون کو عزیز، پینٹنگس کا درس دیا کرتے۔ پہلے انہیں ماہانہ فیس ملا کرتی تھی، جب بیگم شاہدہ سے حاصل کئے ہوئے پیسے پینے پلانے کے لئے کافی نہ ہوئے تو انور رشید نے ٹیوشن فیس کو ماہواری کے بجائے ہفتہ واری میں تبدیل کروانے کی

تجویز رکھی۔ یہ کام ہوا تو دونوں کے عیش و عشرت کے دنوں میں اضافہ ہو گیا۔

لٹریچر ہو کہ مذہب یا فنون لطیفہ کے موضوعات ان پر عزیز معلوماتی اور فکر انگیز بحث کر سکتے ہیں لیکن کبھی کبھی دوستوں کی محفل میں گرمی آجاتی ہے اور وہ بولنے لگتے ہیں تو پھر کسی کو بولنے نہیں دیتے اور جب وہ چپ ہو جاتے ہیں تو سمجھئے ان پر نیند کا غلبہ طاری ہو رہا ہے۔ کبھی نیند سے چونک کر محفل کو چونکا بھی دیتے ہیں، بعض وقت کسی دوست نے اپنی دانست میں کوئی دانشورانہ بات کہدی تو عزیز کا ردعمل فی البدیہہ ہوتا ہے، کم سے کم الفاظ میں وہ اپنا مافی الضمیر واضح کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی نے کہدیا کہ بات سوچ سمجھ کر عقلمندی کی کرنا چاہئے تو وہ برجستہ کہہ اٹھیں گے۔ ''سوائے ناسمجھ اور پاگل انسانوں کے سب ہی عقلمندی کی باتیں کرتے ہیں''۔ یعنی یہ کہ جو عقلمند نہ ہوگا وہ بے عقلی کی ہی باتیں کرے گا۔

عزیز کسی محفل میں موجود ہوں اور کوئی کہے کہ ''آدمی کو راستہ دیکھ کر چلنا چاہئے'' تو عزیز فوراً جواب دیں گے: ''کیا اندھے راستہ دیکھ کر نہیں چلتے۔ اجی جناب بصارت سے کیا ہوتا ہے، بصیرت درکار ہے''۔

ایک محفل میں فرانس اور روس کے انقلاب کی بات ہو رہی تھی، چین کا بھی حوالہ دیا گیا۔ کسی نے کہا کہ موجودہ حالات میں دنیا کو ایک بڑے انقلاب کی ضرورت ہے، اس پر عزیز نے جملہ کسا: ''انقلاب کیا ہوتا ہے؟ سب سے بڑا انقلاب تو دنیا میں اسی وقت آیا تھا جب انسان پیدا ہوا تھا!''

ابھی کچھ عرصہ قبل بیرون ملک سے عزیز نے مجھے فون کیا تھا، خیر خیریت کے بعد غیر ضروری باتیں دہرائی جانے لگیں۔ میں نے کہا ہم لوگ ٹیلی فون پر بے کار کے پیسہ اور وقت ضائع کر رہے ہیں۔ عزیز نے فوراً جواب دیا ''ضائع ہونے کا سب سے بڑا سبب تو بہ نفسہ ہمارا وجود ہے''۔ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ غالبؔ کا یہ شعر یاد آگیا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

دوستیاں ہو جاتی ہیں، کی نہیں جاتیں۔ میں نے عزیز کی دوستی میں کلفتیں بھی پائی ہیں لیکن اس کا حساب برابر کا ہے۔ یعنی میں نے بھی انہیں کلفتیں پہنچائی ہیں۔ دوستی میں یہ تو ہوتا ہے۔ البتہ جو الفتیں ان سے مجھے ملیں وہ کثیر ہیں۔ آپ اگر عزیز کے دوست ہیں تو شاید یہی تجربہ آپ کا بھی رہا ہوگا۔ انوکھا پن تو ہر انسان کی شخصیت کا جز ہے لیکن عزیز میں اس کی حیثیت کل کی ہے۔ اس کا مزہ وہی لے جو عزیز کا دوست ہے۔

اگست ۲۰۰۸ء

•❖•

قادر علی خان (آئی اے ایس) مرحوم

(اعلیٰ ظرفی کا نمونہ)

۳۱ ردسمبر ۲۰۰۸ء کا دن شروع ہی ہوا تھا کہ نواب میر قادر علی خان آئی اے ایس نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ اُن کی بیگم نیرّ کے لیے یہ بڑا ہی دلفگار سانحہ تھا۔ اپنی اٹھارہ سال کی عمر سے (۱۹۷۰ء تا ۲۰۰۸ء) ایک ایک پل جس محبوب کی سنگت میں گزرا تھا اب وہ محبوب نہیں رہا۔ گذشتہ آٹھ سال سے قادر علی خان بستر سے لگے پڑے تھے اور نیرّ نے اس تمام عرصہ میں انہیں اپنی ذات پر پوری طرح اوڑھ لیا تھا۔ وہ ان کے شوہر نہیں بلکہ ایک ''دوست'' تھے۔ پہلی ملاقات سے لے کر موت تک وہ انہیں دوست ہی کہتی رہیں اور ان کی دلداری اور غمگساری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ قادر علی خان صاحب کی پہلی بیگم بھی حیات تھیں۔ ان سے آٹھ اولادیں ہوئیں۔ دوسری بیگم سے دو اور ہوئیں۔ مرحوم کی وہ کون سی خصوصیات رہی ہوں گی کہ بہت سی خواتین ان پر فریفتہ رہیں۔ ایک لڑکی نے تو نیرّ سے یہ تک کہدیا کہ اگر نیرّ راستے سے ہٹ نہ جائے تو وہ خودکشی کرلیں گی۔ نیرّ کے سرپرست بھی کسی بہانے تیار نہ تھے لیکن نیرّ نے جیسے قسم کھالی تھی کہ وہ شریک حیات بنیں گی تو صرف قادر علی خان کی ورنہ کسی کی نہیں۔ نواب کی پہلی بیگم ورنگل کے صوبیدار کی بیٹی تھیں۔ دونوں کی نہیں نبھی۔ نیرّ بھی نواب خاندان کی رہیں۔ خود قادر علی خان نواب صمصام الملک آصفجاہ کے پوترے تھے۔ شاہی خاندان کے صاحبزادے۔ دوسرے نکاح کے بعد قادر علی خان صاحب کو جیسے جنت مل گئی۔ انہوں نے نیرّ کو جنت ہی کا نام دے دیا اور آخری وقت تک، اسی نام

سے یاد کرتے رہے۔ اس عقد کے بعد وہ دیگر خواتین کے لیے نامحرم ہوگئے۔ آخری لمحات میں نیرّ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ آنکھوں کو لگاتے ہوئے ماتھے تک لے گئے۔ یہ ہاتھ انہوں نے نہیں چھوڑا۔ موت نے چھڑایا۔ ایسے عشق کی داستانیں ہم کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ اس وقت حقیقت سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔

۳۱ ردسمبر کی دوپہر سینکڑوں سوگواروں اور چاہنے والوں کی موجودگی میں نواب قادر علی خان کو درگاہ اجالے شاہ صاحب کے احاطے میں سپرد خاک کردیا گیا۔ حیدرآباد کے وہ تمام باشندے جو میر عثمان علی خان آصف سابع سے واقف ہیں، جانتے ہیں کہ اُس دور کے انتظامیہ کی قادر علی خان آخری نشانی تھے۔ سرکاری ملازم عوام کا خدمت گزار نہیں ہوتا۔ چند استثنائی صورتیں ہوسکتی ہیں بلکہ یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ ان سرکاری عہدیداروں کو ہم انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ قادری علی خان ان میں یکتا اور نمایاں تھے۔ میرا مرحوم سے کیا رشتہ ہوسکتا ہے، ان کے محکمہ سے بھی میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ حیدرآباد کی ریاست کا میں بھی ایک باشندہ تھا۔ کسی کی رحلت پر آدمی اسی وقت آبدیدہ ہوتا ہے جب کہ اس کی کسی نہ کسی طرح کی ذہنی وابستگی مرحوم سے رہی ہو۔ دل کوئی سنگ و خشت تو نہیں کہ رونے سے باز آئے۔ میری مرحوم سے کئی ذہنی وابستگیاں تھیں۔ سن ۱۹۶۵ء کے آس پاس کا دور ہے۔ قادر علی خان صاحب سنگاریڈی (ضلع میدک) کے کلکٹر ہیں۔ پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہونے کے بعد میری پہلی پوسٹنگ محکمہ امداد باہمی میں سنگاریڈی پر ہوئی۔ ایک بار مقامی کلب میں قادر علی خان صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ سنگاریڈی میں ہونے والے سرکاری مشاعرہ میں شرکت کیلئے میں حیدرآباد کے شاعروں کو مدعو کرنے کی ذمہ داری لوں۔ اسی سلسلہ میں ایک بار مجھے ان کے اجلاس پر جانے کا موقع ملا۔ میں ملگجی رنگ کے کھادی کے کپڑے کی شیروانی پہنے ہوئے تھا۔ انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بے ساختہ سوال کر بیٹھے کہ شیروانی کا کپڑا کہاں سے لیا اور کس جگہ اسے سلوایا۔ میں دنگ رہ گیا کہ ایک کلکٹر اپنے اجلاس پر بیٹھا ہوا ہے، آزو بازو دوسرے عہدیدار ہیں۔ اسے نہ اپنے پروٹوکول

کی پرواہ ہے نہ مخاطب کے بڑے چھوٹے ہونے کی۔ میں حیرت سے کھڑا کھڑا قادری علی خان صاحب کو تکتا رہا۔ لمحہ بھر کے لیے مجھے اپنی ابتدائی ملازمت کا واقعہ یاد آیا۔ کریم نگر مستقر پر میری پوسٹنگ ٹائپسٹ کی تھی۔ یونین گورنمنٹ کے ایک آفیسر کے سامنے جن کا تعلق آندھرا سے تھا، مجھے پیش ہونا تھا۔ جوں ہی میں اس کے اجلاس میں داخل ہوا، اس آفیسر نے مجھے گھور کر دیکھا اور اپنے ماتحت سے مخاطب ہوکر کہا (اے اڑوی نونچی پکھو وچی ناؤ) ''کس جنگل سے پکڑ کر لائے ہو'' میرا قصور یہ تھا کہ دروازہ پر میں نے اپنا جوتا نہیں اتارا اور اُسے جھک کر سلام نہیں کیا۔ اس لمحے سے نکل کر میں قادر علی خان صاحب کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ کلکٹر کے ہشاش بشاش چہرہ کو دیکھتے ہوئے لگا کہ چھوٹے قد اور مختصر جسم کا یہ شخص بڑا قد آور اور جسیم ہے۔ مشاعرہ میں سلیمان اریبؔ، تاج مہجور کے علاوہ چند اور شعرا حیدرآباد سے شریک ہوئے۔ یہ دونوں شاعر میرے مہمان رہے۔ مشاعرہ کامیاب ہوگیا۔ اس واقعہ کے بعد وہ میرے لیے کلکٹر نہیں رہے بلکہ ایک معزز اور معتبر دوست جن سے تہذیب، ثقافت اور انتظامی امور کے کئی گُر سیکھے جاسکتے ہیں۔ اگلی ملاقاتوں میں یہ بھی دیکھا کہ جب بھی کوئی اہل غرض کوئی عرضداشت لے کر ان کے اجلاس پر آتا تو وہ اس کی بات پوری طرح دلجوئی سے سنتے اور عرضی کو پڑھ کر متعلقہ عہدیدار کے نام کی ہدایات جاری کرتے۔ اپنی ڈائری میں اسے نوٹ کر لیتے اور مقررہ تاریخ تک رپورٹ نہ آتی تو عہدیدار کو طلب کرتے۔ ایڈمنسٹریشن کا تو یہ طریقہ کار تھا۔ دوسرے واقعات یہ رہے کہ اُسی زمانے میں تبت، برما اور بنگلہ دیش پتہ نہیں کہاں کہاں سے رفیوجیز آتے تھے۔ ان کے رہنے اور کھانے کا انتظام تو حکومت کی طرف سے ہوجاتا لیکن ان کے بیڑی، پٹے کا مسئلہ رہ جاتا۔ ایک دفعہ میں کلکٹر کے بنگلے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ کلکٹر صاحب تنخواہ لے کر بیڑی کے کٹے اور تمباکو کے پیکٹ خرید کر رفیوجیز میں بانٹنے کے لیے گیے ہیں۔ یہی سبب رہا ہوگا کہ جب قادر علی خان صاحب سنگاریڈی سے تبادلہ ہوکر حیدرآباد منتقل ہو رہے تھے تو ٹرک کے کرایہ کے پیسے نہ تھے۔ ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ ابھی جب کہ ان کا وظیفہ جاری نہیں ہوا تھا ایک دن وہ اختر حسن صاحب سے ملنے کے لیے اردو اکاڈمی پیدل جا رہے تھے راستے میں اکاڈمی

کا ایک ملازم سیکل پر جاتا ہوا نظر آیا۔ وہ اس کی سیکل کے کیریر پر بیٹھ گیے اور باقی راستہ طے کیا۔

دراصل میں قادر علی خان صاحب کے نام سے اپنے کالج کی طالب علمی کے زمانے سے ہی واقف تھا۔ ہمارے مضامین میں معاشیات کا بھی ایک مضمون تھا۔ ان دنوں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا بڑا چرچا تھا۔ معاشیات کے نصاب میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ مرکز میں ایس۔ کے۔ ڈے اس کے منسٹر تھے اور قادر علی خان اس منسٹری سے وابستہ تھے۔ حیدرآباد شاید انہیں اسی لیے الاٹ کیا گیا کہ یہاں شادنگر اور بٹن چیرو میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پراجکٹ قائم کیے گیے تھے۔ اسی دور میں انہوں نے بیدر ضلع میں بھی کام کیا تھا۔ مرزا پور کے ڈاک بنگلے کی تعمیر کی پورے ضلع ہی میں نہیں بلکہ پوری ریاست میں شہرت ہوئی۔ قادر علی خان صاحب کی نگرانی میں یہ بنگلہ بنا تھا۔ کہتے ہیں کہ صرف تین ہفتوں کی مدت میں بہت ہی خوبصورت اور ہر طرح سے آراستہ عمارت کی تعمیر عمل میں آئی۔ پنڈت نہرو اس کے پہلے مہمان رہے۔ غرض کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے تحت ہوئے کارناموں کی وجہ قادر علی خان صاحب کی بڑی شہرت ہوئی۔ مرکز اور ریاست دونوں جگہ ان کا نام روشن ہوا۔ اس پراجکٹ کے تحت زرعی ترقی کے علاوہ دیہاتوں کی سطح پر پنچایت راج، امداد باہمی کی انجمنیں، مدارس اور چھوٹی بڑی مصنوعات کو بھی ترقی ہوئی۔

یہ سب تو ہوتا رہا لیکن چند دلچسپ واقعات ۱۹۵۶ء کے بعد کے سننے میں آئے۔ ریاستوں کی تنظیم جدید کے بعد آندھرا پردیش کی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو آندھرا پردیش اور تلنگانہ کے آفیسروں میں رسہ کشی چند برس تک چلتی رہی۔ ان کی بہتر تفصیل ہاشم علی اختر آئی اے ایس اور وائس چانسلر کی تحریروں میں ہمیں ملے گی (ہندوستانی مسلمان منزل کی تلاش میں)۔ مختصراً یہ کہ آندھرا کے آفیسروں کے ہاتھ میں اقتدار تھا تو تلنگانہ کے عہدیدار اپنی تہذیب اور تنظیمی صلاحیتوں سے لیس تھے۔ مزید یہ کہ ان عہدیداروں میں ایمان داری اور رعایا پروری کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے تھے، جبکہ آندھرا کے آفیسر نہ صرف خود غرض بلکہ غلامانہ ذہنیت کے شکار تھے۔ ان میں خود اعتمادی بھی نہیں تھی۔ اسی لیے یہ لوگ تلنگانہ کے عہدیداروں سے حسد رکھتے تھے اور

انہیں نقصان پہنچانے کا ہر موقع تلاش کرتے تھے۔ قادر علی خان صاحب کا معاملہ کریلا اور نیم چڑھا جیسا تھا۔ نہ صرف یہ کہ تنظیمی صلاحیتوں سے مالا مال تھے بلکہ آصفجاہی خاندان کے چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے ان میں خود اعتمادی بھی تھی۔ بانکپن تو ان کی جبلت کا ایک حصہ تھا۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد آئی اے ایس، ایسے کئی واقعات کے گواہ ہیں۔ آندھرا کے ایک آفیسر سباراؤ تھے جو ضلع پریشد کی میٹنگوں کو چلاتے تھے۔ قادر علی خان صاحب کی بحث مدبرانہ ہوتی اور سباراؤ کو موقع نہ ملتا کہ وہ اپنی بات کہتا۔ اس کا بدلہ اس نے اس طرح لیا کہ قادر علی خان صاحب کی شخصی کمزوریوں اور چند ادھر ادھر کے واقعات کو جمع کرکے ان کے خلاف اعلیٰ عہدیداروں کے پاس رپورٹ پیش کردی۔ آندھرا کے چند دوسرے آفیسرس بھی قادر علی خان صاحب کی مقبولیت اور بے باکی سے گھبراتے تھے۔ انہوں نے بھی مل کر سازشیں کیں۔ اس ماحول میں قادر علی خان صاحب کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ ملازمت کا سلسلہ جاری رکھتے۔ ان کے بہی خواہوں میں ہاشم علی اختر صاحب بھی تھے۔ شاید انہی سے مشورہ کے بعد انہوں نے قبل از وقت وظیفہ لے لیا۔ اس بات کی پروا نہیں کی کہ اپنے اہل و عیال کی ضرورتیں اور بچوں کی پڑھائی کے اخراجات کی پابجائی کیسے ہوگی۔

وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد سے اقوام متحدہ کی ملازمت تک کا عرصہ قادر علی خان صاحب کی زندگی میں بڑا کٹھن گزرا۔ ان کے کئی تجربوں میں انڈسٹریز کے محکمہ اور مائننگ کارپوریشن میں کام کرنے کا تجربہ بھی شامل تھا۔ انہیں اقوام متحدہ کے متعلقہ عہدیداروں نے فیجی آئی لینڈ میں (United Nations Industrial Development Organisation) کے ادارہ کے سربراہ کی حیثیت سے منتخب کیا۔ دو سال کی نمایاں خدمات کے بعد حیدرآباد واپس ہوئے تو ڈاکٹر چنا ریڈی نے انہیں اپنے گھر پر مدعو کیا۔ حیدرآباد و سکندرآباد کے غریب عوام کے مسائل پر بات ہوئی تو قادر علی خان صاحب نے چیف منسٹر کو اپنے مشوروں سے نوازا۔ چنا ریڈی نے تفصیلی رپورٹ مانگی تو انہوں نے "Setwin" کے عنوان سے تفصیلی پراجکٹ رپورٹ تیار کی۔ اس طرح سے Self employment & Training for the Twin cities ادارہ

کا قیام عمل میں آیا۔ چیف منسٹر نے کہا It is the Brain child of Khader Ali Khan اور انہیں اس ادارہ کا چیرمین اور منیجنگ ڈائرکٹر کا عہدہ دے کر ان کی خدمات حاصل کیں۔ اس ادارہ نے جو کچھ کیا اور جو کچھ آج بھی کر رہا ہے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ یہاں یہ بات حیرت انگیز لگتی ہے کہ ڈاکٹر چنا ریڈی جیسے آدمی سے قادر علی خان صاحب نے کس طرح سمجھوتہ کیا ہوگا۔ جبکہ چنا ریڈی کا نام اُن چیف منسٹروں کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے جن میں کشمیر کے بخشی غلام محمد، پنجاب کے کائران اور ٹاملناڈو کی جیہ للیتا شامل ہیں۔ ایک زمانے میں B.B.C بخشی برادرس کارپوریشن کی اصطلاح بہت مشہور ہوچکی تھی۔ ڈاکٹر ریڈی اور خان صاحب میں ایک اہم خصوصیت مشترک تھی، وہ تھی اڈمنسٹریشن کی صلاحیت۔ دونوں یہ جانتے تھے کہ اسی میں عوام کی بھلائی ہے۔ چنا ریڈی بھی قادر علی خان صاحب کی صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے عوام میں نیک نامی چاہتے تھے اور قادر علی خان صاحب ایسا کوئی بڑا کام نہیں کرسکتے تھے جب تک کہ انہیں حکومت کی سرپرستی حاصل نہ ہو۔ اُن کے کارناموں میں ایک اہم کارنامہ درشہوار ہاسپٹل کا قیام بھی ہے۔ نواب مکرم جاہ کی ایما پر انہوں نے اس دواخانے کی تعمیر کروائی۔ اس کے وہ پہلے ڈائرکٹر رہے۔
یہاں اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ قادر علی خان صاحب کے ہم عصر یا سینئر عہدیداروں میں جو نام شامل ہیں ان میں محامد علی عباسی، ہاشم علی اختر، غلام حقانی انصاری، راچند رراؤ اور رام لعل کے نام نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ جن خاص شخصیتوں کی قربت قادر علی خان صاحب کو حاصل تھی وہ تھے نواب مہدی نواز جنگ، بیرسٹر اکبر علی خان، یونس سلیم (مرکز کے وزیر) اور میر احمد علی خان (ریاست کے وزیر)۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ تو وہ ہمیشہ نرمی سے پیش آتے اور انسان دوستی بھی ان میں بلا کی تھی لیکن دھوکہ دینے وا لے اور بددیانت لوگوں کو وہ ایک لمحہ کے لیے برداشت نہ کرتے۔ ان کا غیظ و غضب میں آنا بھی مثالی ہوتا۔ اختر حسن صاحب کے صاحبزادے ایمن اپنا ایک واقعہ سناتے ہیں کہ کسی کام سے وہ سٹ ون پہنچے تو انہیں قادر علی خان صاحب کے اجلاس سے بہت اونچی غیظ و غضب کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ اس موقع پر انہیں چیرمین

سے ملنا چاہئے کہ نہیں۔ انہوں نے قادرعلی خان صاحب کو اپنے ملاقاتیوں سے یہ کہتے ہوئے سنا "Get out from here, you rascales, cheats". جو لوگ کمرے سے نکل رہے تھے، وہ روڈی ٹیٹرس لگے۔ انہوں نے قادر علی خان صاحب پر دباؤ ڈال کر سٹ ون کے ادارہ سے ایسی امداد حاصل کرنا چاہی جس کے وہ مستحق نہ تھے۔ نتیجہ سامنے رہا۔ اب جو ایمن میاں قادرعلی خان صاحب کے سامنے پہنچے تو انہوں نے اپنی تلخی یکلخت بدلی۔ بڑے پیار سے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور جو کام کرنا تھا وہ کیا۔

قادرعلی خان صاحب کا ایک اور واقعہ جو، ان کی اعلیٰ ظرفی سے متعلق ہے بیان کرتے ہوئے میں اس مضمون کو اختتام پر پہنچانا چاہوں گا۔ وظیفہ پر سبکدوش ہونے پر ۱۹۷۶ء کے آس پاس انہوں نے چند خانگی اداروں میں کام کیا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ایک بار ان کی مڈ بھیڑ ڈاکٹر عظیم بخش سے ہوئی۔ قادرعلی خان ایڈمنسٹریشن کے ماہر لیکن وہ پولٹری صنعت سے ناواقف تھے۔ دونوں میں اختلاف ہوا۔ بحث گرما گرم ہوئی اور ڈاکٹر عظیم بخش ناراض ہو کر وہاں سے چلے گئے قادرعلی خان صاحب نے بعد میں عظیم بخش سے معذرت چاہی۔ جب وہ فیجی میں Unido کے چیرمین بنے تو انہوں نے ڈاکٹر عظیم بخش کا نام اقوام متحدہ کو بھیجا اور لکھا کہ انہیں پولٹری کے ماہر کی حیثیت سے فیجی بلایا جائے۔ ڈاکٹر عظیم بخش شاید راضی ہو جاتے لیکن ان دنوں انہیں بہتر مواقع سعودی میں ملے۔ وہ وہاں چلے گئے۔ اب وہ جب بھی قادرعلی خان صاحب کو یاد کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس طرح کے اعلیٰ ظرف انسان بہت کم دیکھنے میں آئے۔

۱۹۹۰ء کے بعد قادرعلی خان صاحب بنجارہ ہلز کے روڈ نمبر ۱۴ پر کرایہ کے مکان میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ پنشن میں گزارہ کر لیتے۔ ان کی زندگی سرکاری ہو کہ خانگی شروع سے آخر تک ایک دباؤ کا شکار رہی، اس میں خود ان کے مزاج کا دخل تھا۔ مستعدی اور تندہی کے علاوہ حُسن پرستی بھی اس کا خاصہ تھی۔ ان کا شدید اثر شاید اعصاب پر پڑا۔ جب وہ اسّی (۸۰) سال کے ہوئے تو کھڑے کھڑے ہی ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اسی مقام پر بیٹھ گئے جہاں

کھڑے تھے۔ آٹھ سال تک پاؤں کی ہڈیوں میں اتنی سکت نہیں آئی کہ چل سکتے۔ باقی عمر ایک خدمت گزار اور ٹوٹ کر چاہنے والی خاتون کو دیکھ دیکھ کر گزاری۔ ان کے ہم عصر سوائے ڈاکٹر حسن الدین احمد کے جنھیں اُس دور کا خاصہ شخصی تجربہ وار مشاہدہ ہے۔ سب تو اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ انہیں اب کسی کا انتظار نہ تھا۔ سن ۲۰۰۸ء کے آخری دن سینکڑوں سوگوار جو کبھی ان کی عیادت کو نہ آسکے تھے تدفین کے وقت موجود تھے۔ بیگم نیرّ کو احساس ہے کہ قادرعلی خان صاحب کے دوست و اقارب دوران حیات تو ان سے غافل رہے، ہماری قوم کی یہ مردہ پرستی بھی غنیمت ہے، ورنہ یہ صدمہ تو نیرّ کا اپنا ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ حیدرآبادیوں کے لیے تو وہ آصفجاہی دور کے انتظامیہ کی آخری شمع تھے۔ وہ تو گُل ہو گئی، لیکن نیرّ کے لیے یہ شمع خود ان کی اپنی حیات تک روشن رہے گی۔ محبوب کی یاد ہمیشہ شمع ہی کی طرح روشن رہتی ہے اور اُس میں سے اگر کی خوشبو مہکتی ہے۔

جنوری ۲۰۰۹ء

•❖•

ڈاکٹر وحید اختر

(بچپن اور طالبِ علمی کا زمانہ)

ڈاکٹر وحید اختر آخری بار ۱۹۹۶ء کے اختتام پر حیدرآباد آئے تو چند طبی سہولتوں کی بدولت اُن کا قیام میرے پاس رہا۔ ستیا کڈنی سنٹر اور اپولو ہسپتال کے ڈاکٹروں سے انھوں نے مشورہ کیا اور پانچ چھ دن اُن دواخانوں میں بھی گزارے، آہستہ آہستہ ان کا مزاج ٹھیک ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے کے لائق ہوگئے۔ میرے پاس پانچ ہفتوں کے قیام کے بعد جس دن وہ حیدرآباد سے جارہے تھے تو اُنھوں نے نامپلی ریلوے اسٹیشن کی سیڑھیاں پیدل طے کیں تھیں حالاں کہ جس دن وہ یہاں پہنچے تھے اُنھیں وہیل چیر کے ذریعے کار تک لایا گیا تھا۔ اُن کے قیام کے دوران میں نے اُن سے خواہش کی کہ وہ اپنے بچپن اور طالب علم کے زمانے پر روشنی ڈالیں تو وہ آمادہ ہوئے۔ کوئی پون گھنٹے تک میں نے اُن کی باتیں ریکارڈ کیں یہ گفتگو احباب اور قارئین کی نذر ہے۔

سوال : وحید اختر صاحب آپ ۱۹۶۰ء کے آس پاس حیدرآباد سے علی گڑھ منتقل ہوئے۔ اُس کے بعد آپ نے علم وادب کی دنیا میں جو ترقی کی اور جو شہرت پائی اس سے ہم سب واقف ہیں۔ لیکن میری طرح آپ کے کئی قریبی دوست آپ کے بچپن اور آپ کی طالب علمی کے دور سے ناواقف ہیں۔ آپ اس پر روشنی ڈالیں؟

جواب : میری پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ میرے والد عدالت میں نائب ناظر تھے۔ میں تیسری اولاد تھا۔ گھر کے حالات ٹھیک ہی تھے۔ جب والد کے آنکھوں کی بینائی کم ہونے لگی تو اُنھیں لمبی چھٹی لینی پڑی۔ اُس وقت میں سات آٹھ برس کا تھا۔ یہیں سے غربت کا دور شروع ہوا۔ آدھی تنخواہ پر گزارہ مشکل ہوگیا تو ابا ہم لوگوں کو لے کر اپنے آبائی وطن نصیرآباد (رائے بریلی) منتقل ہوئے۔ وہاں ہمارا ایک مکان تھا۔ ابا کی والدہ اور بہنیں وہاں تھیں۔ ابا اپنی ملازمت کے زمانے میں اُن کے کفیل تھے۔ ابا کو گٹھیا کی بیماری ہوئی۔ اب وہ اپنی والدہ اور بہنوں کو پیسے نہیں دے سکتے تھے تو اُن لوگوں کا رویہ بدل گیا۔ اس کا اثر والد کے دماغ پر پڑا۔ والدہ نے فیصلہ کیا کہ ہم سب کو لے کر واپس اورنگ آباد آجائیں۔ اس کے بعد کا دور ہمارے افلاس کا دور تھا۔ اس غربت میں بھی بھائیوں کی پیدائش ہوتی رہی۔ بڑی بہن بچپن ہی میں گزر گئیں تھیں، ہم آٹھ بھائی تھے۔ چھ بھائی مجھ سے چھوٹے تھے۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ اُس زمانے میں ایک روپے میں آٹھ جوڑی ربر کی چپلیں ملتی تھیں لیکن میں دو آنے کی ایک جوڑی چپل بھی خرید نہیں سکتا تھا۔ چناں چہ میٹرک تک ننگے پاؤں ہی اسکول جاتا رہا۔ لیکن اسکول میں ریاضی، سائنس اور ڈرائنگ میں ہمیشہ اول آتا رہا۔ بڑے بھائی کو جب کہ وہ چھٹی جماعت میں تھے پولیو ہوگیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی پوری زندگی میرے ہی سہارے گزاری۔ دوسرے بھائی محنت مزدوری کرتے تھے۔ کوئی رکشا چلاتا اور کوئی ہوٹل میں کام کرتا۔ ایک بھائی لاپتہ ہوگیا تو ابھی تک لاپتہ ہی ہے۔ ایک نے خودکشی کرلی۔ مجھ سے چھوٹے بھائی بعد میں نصیرآباد کے یتیم خانے میں شریک کرائے گئے۔ میرے علی گڑھ میں لکچرار بننے تک یہ لوگ یتیم خانے ہی میں رہے۔

میں اپنی نو، دس سال کی عمر ہی سے ریڈیو میں کام کرنے لگ گیا تھا۔

میر حسن صاحب اسٹیشن ڈائرکٹر تھے ۔ میں بچوں کے پروگراموں میں شامل ہوتا۔ تحریری اور زبانی پروگرام کے علاوہ ڈراموں میں بھی کام کرتا۔ ہفتے میں جمعہ کا ایک دن ہوتا ۔ پانچ روپے معاوضہ ملتا۔ اس طرح مہینے میں بیس روپے مل جاتے ۔ میں اُسی زمانے میں مجلس بھی پڑھتا تھا۔ لیکن والد صاحب کے کہنے پر اُس کا معاوضہ نہیں لیتا۔ انٹر کی پڑھائی کے دوران والدہ گزر گئیں ۔ پھر والد بھی گزر گئے ۔ کرایے کا مکان خالی کرنا پڑا۔ اس کے بعد زندگی ایک طرح سے فٹ پاتھ پر بسر ہوئی ۔ اُنھیں دنوں مخدوم محی الدین جیل سے چھوٹ کر آئے تھے۔ اُن سے سلیمان اریب اور عزیز قیسی سے اورنگ آباد ہی میں ملاقات ہوئی ۔ انٹر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اورنگ آباد میرے لیے چھوٹی جگہ ہے اور مجھے حیدرآباد میں رہنا چاہئے۔ میں بی۔اے، کے لیے حیدرآباد چلا آیا اور ہاسٹل میں رہنے لگا۔ ہاسٹل کی فیس ٹیوشن کے ذریعے اور ریڈیو پروگراموں کے معاوضے سے ادا کرتا۔ اکثر فیس کی کمی کی وجہ سے کئی کئی دن فاقے کرنے پڑتے۔ یہاں تک کہ چائے کے لیے بھی پیسے نہ ہوتے۔ بی۔اے، کے امتحان کے زمانے میں تین دن کا فاقہ کرنا پڑا تھا۔ اس کے باوجود میں نے امتحان میں اسٹیٹ ٹاپ کیا تھا۔ بی۔اے، پاس کرنے کے بعد دوست احباب نے مشورہ دیا کہ اے۔جی۔ آفس، کی نوکری کرلوں تاکہ چھوٹے بھائیوں کی زندگی سنور سکے۔ کچھ اور لوگوں نے کہا کہ بی۔اے، میں ٹاپ کرنے کے بعد نوکری کرنا مناسب ہوگا۔ پھر بھی ایم۔اے، جائن کیا۔ کبھی ہاسٹل میں رہا اور کچھ دن متین سروش کے پاس۔ پڑھائی جاری رکھتے ہوئے بھی چھوٹے بھائیوں کی مدد کرتا رہا۔ ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کا دور بھی اسی طرح گزرا۔ اسکالرشپ بڑی دیر میں ملی۔ اس میں بے ایمانی ہوئی۔ ہوا یوں کہ اُس زمانے میں بھگوتم صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ میرے علاوہ پانچ اور لڑکے اسکالرشپ کے طالب تھے۔ میرا

نمبر اول تھا لیکن بھگوتم صاحب نے شروع کے پانچ نام کاٹ کر چھٹے کو وظیفہ منظور کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں کوئی قاعدہ قانون نہیں تھا۔ علی گڑھ میں تو قاعدہ ہے کہ جو ٹاپ کرے گا اُسی کو وظیفہ ملے گا۔ اس کی خلاف ورزی نہیں ہوسکتی ۔ اس کے خلاف بڑا احتجاج ہوا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے مین کائنڈ (Mankind) میں اڈیٹوریل لکھا۔ بعد میں وظیفہ منظور ہوا۔

سوال : یہ تھی آپ کے بچپن اور طالب علمی کے دور کی زندگی۔ اب ذرا اس سے ہٹ کر کچھ ایسے واقعات جو لوگوں کے نیک اور برے سلوک سے متعلق ہوں ۔ جو آپ کے ذہن پر نقش ہوکر رہ گئے ۔ ایسے واقعات جن کی شدت کو آپ آج بھی محسوس کرتے ہوں بیان کیجیے۔

جواب : جہاں تک اُستادوں کا معاملہ ہے پڑھائی کی وجہ سب نے خیال رکھا اور نیک سلوک کیا ۔ اسکول میں میں ہمیشہ مانیٹر رہا اور یونین کا پریسیڈنٹ اور سکریٹری بھی رہا۔ نیک سلوک یہ تھا کہ میر حسن صاحب نے ریڈیو میں کام دلا دیا تھا۔ والد صاحب کی تنخواہ کے ساتھ ماہانہ بیس روپے کا اضافہ اچھا خاصا تھا۔ تلخ باتوں میں اُسی زمانے میں ایک نواب صاحب کے لڑکے کا ہے ۔ اُن کے لڑکے نے جو اب میرے ہم زلف ہیں معمولی سکنڈ کلاس پاس کیا تھا لیکن اُن کی بہت بڑی دعوت ہوئی۔ شہر کے بڑے بڑے آفیسر آئے ۔ عمائدین اور معززین آئے ۔ اُنھیں پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا گیا۔ میں ٹاپ کرنے کے باوجود ایک کونے میں بیٹھا تھا اور میرے حصے میں آئس کریم کا ایک ٹکڑا تشتری میں آیا (ہنستے ہوئے)۔ دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ فصاحت جلیل کے ایک پوتے تھے، معتمدِ تعمیرات، جنید اُن کا نام تھا۔ اُنھیں بھی شاعری کا شوق تھا۔ ہم اُن کے ہاں پانی بھرنے جاتے تھے۔ مالکِ مکان نے نل کٹوا دیا تھا اس لیے کہ پانی کے لیے زائد دو روپے نہیں دے سکتے تھے۔ ایک دن ہم

پانی بھرنے گئے تو اُن کے ہاں ڈرائنگ روم میں لوگ بیٹھے تھے۔ شاعری کی محفل تھی، شاعری سے مجھے دلچسپی تھی، میں وہاں گیا۔ پاجامے کے دونوں پائنچے چڑھے ہوئے۔ دونوں ہاتھوں میں دو بکٹ، اسی حلیے سے میں وہاں کھڑا رہا اور مشاعرے کو سننا چاہا۔ اُنھوں نے مجھے ڈانٹ کر وہاں سے بڑھا دیا۔ اُس کے ڈیڑھ دو سال کے اندر میں اورنگ آباد میں شاعر کی حیثیت سے روشناس ہوگیا تھا۔ اب میں نے جو مشاعرہ پڑھا تو اُن لوگوں کی حیثیت سامعین کی ہوگئی۔ اُس کے بہت برسوں بعد حیدرآباد میں نظام کے پوتے تقی علی خاں ثاقب کے پاس ایک شعری نشست تھی۔ جنید صاحب بھی مشاعرہ سننے آئے تھے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ جنید صاحب بھی شعر سننے کے لیے بیٹھے ہیں تو میں نے جان بوجھ کر دو گھنٹے کی دیر کی تا کہ وہ میرا انتظار کریں۔ مشاعرے کے اختتام پر جب میں نیچے گیا تو میں نے اُنھیں یاد دلایا کہ کس طرح اُنھوں نے ہمیں ذلیل کیا تھا۔

سوال : جب آپ تین دن فاقے کرتے تھے تو آپ کو کبھی خیال نہیں آیا کہ سماج سے اس کا انتقام لیا جائے۔

جواب : انتقام کا کیا سوال تھا۔ صرف خودکشی کی سوچتے تھے۔ وہ بھی مناسب معلوم نہیں ہوا۔ اُس سے کیا حاصل ہوگا۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کے زمانے میں بھی کئی بار ایسا ہوا کہ تین تین چار چار دن فاقے کرنے پڑے۔ اکثر۔ لیکن اُس زمانے میں ادبی مقابلوں اور سمپوزیم وغیرہ میں خوب حصہ لیتے تھے اور کسی کو یہ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم نے کھانا کھایا ہے یا چائے نہیں پی۔ فاقے کے دوران یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کھانا کبھی ملنے والا نہیں ہے۔ شروع میں بے چینی ہوتی تھی۔ پیٹ میں درد ہوتا تھا۔ نیند نہیں آتی تھی لیکن ایک آدھ دن گزرنے کے بعد جنون اور نشے کی کیفیت طاری رہتی تھی اور آرام سے وقت گزر جاتا تھا سوائے اس کے کہ خالی پیٹ کی وجہ

درد محسوس ہوتا اور چلنے پھرنے میں کمزوری ہوتی تھی۔ لیکن اسی دور میں زیادہ پڑھنے لکھنے کا کام ہوا۔ شاعری اچھی کی اس لیے کہ وہ غصہ جو سماج کے خلاف تھا، سسٹم کے خلاف تھا، اس کا اظہار ہوتا رہا۔ مضامین بھی لکھے۔ ۱۹۵۸ء میں جو بحث چلی تھی، سجاد ظہیر سے جنھوں نے پورے ترقی پسند ادیبوں کو ایک نیا ٹرنڈ دیا اور جدیدیت کا آغاز کیا۔ وہ اُسی زمانے کی چیز ہے۔ وہ چھپا ہے۔ یہ دور وہی تھا فاقہ کشی کا دور۔ اُس زمانے میں فکری مسائل پر اور جذباتی مسائل پر بھی سوچا۔ احساسات بھی شدید تھے شاعری کے ذریعے اُس کا اظہار کیا۔ جہاں تک تخلیقی معاملہ تھا میرا یہ دور مالا مال رہا۔

سوال : اس کے بعد شاید مذہب بیزاری بھی۔ مذہب سے انحراف بھی ہوا۔

جواب : بچپن سے تو ہمارا ماحول خاصا مذہبی تھا۔ جیسا کہ میں نے ذکر کیا۔ میں مجلسیں پڑھنے لگا تھا۔ پہلے مرثیے پڑھے، پھر ذاکر بنا۔ انٹرمیڈیٹ میں آنے تک تو دو دو گھنٹے کی مجلسیں پڑھتا تھا۔

سوال : اب بھی پڑھتے ہیں آپ!

جواب : نہیں۔ بیچ میں ایک لمبا عرصہ چھوڑ دیا تھا، کچھ ایسے تجربے ہوئے کہ باوجود غربت اور فاقہ کشی کے والد گھر کی مجلس پڑھنے کے پیسے لینا برا سمجھتے تھے۔ چاہتے تو ہم اُس سے اچھے خاصے پیسے کما سکتے تھے۔ جب میں نے حیدرآباد میں پہلی بار محرم پڑھا تو لوگوں نے ٹیلیگرام کر کے مجھے بلایا تھا۔ پھر عشرہ ختم ہوا۔ محرم ختم ہوگیا اور کئی دن ہوگئے لیکن واپسی کے لیے کسی نے دس روپے کرائے کے نہیں دیے۔ روز بلاتے تھے، بٹھاتے تھے اور کہتے تھے کہ آج انتظام نہیں ہوا۔ وہاں میری پڑھائی کا نقصان ہو رہا تھا۔ آخر میں جو سکریٹری صاحب تھے وہ مجھے ایک ایرانی کے پاس لے گئے اور کہا کہ یہ لڑکا بہت ذہین ہے۔ اس کو پڑھنے کے لیے یونیورسٹی جانا ہے۔ تب اُس

نے دس روپے دیے۔ واپس آ کر ابا کو میں نے بتایا تو ابا نے آیندہ مجلس پڑھنے سے منع کیا۔ اس کے بعد ایم اے میں ہاسٹل کے لیے پیسے نہیں تھے۔ ایک دوست نے عشرہ پڑھنے کے لیے امراوتی بلایا۔ وہاں اتنے پیسے مل گئے کہ میں تین چار مہینے کی ہاسٹل کی فیس، کھانے اور رہنے کے پیسے دے سکا۔ بس یہی آخری مجلس، اس کے بعد طالب علمی کے زمانے میں مجلس پھر کبھی نہیں پڑھی۔ میں حیدرآباد میں آٹھ سال رہا۔ لیکن کسی مجلس میں نہیں گیا۔ مجھے شیعوں کی انجمن سادات سے وظیفہ ملتا تھا۔ جس سال میں نے بی اے میں ٹاپ کیا، اس سال معلوم ہوا کہ سکریٹری انجمن سادات نے رپورٹ بھیجی کہ اس لڑکے کی تعلیمی حالت خراب ہو چکی ہے۔ وظیفہ بند کر دیا جائے۔ میں نے پوچھا کہ اگر فرسٹ ان فرسٹ آنا تعلیمی حالت کا خراب ہونا ہے تو اچھا ہونا کیا ہوتا ہے؟ بہ ہر حال میں نے راست مرکزی دفتر کو خط لکھا۔ اپنی رپورٹ بھیجی۔ وائس چانسلر کا مبارک باد کا خط اور اخباروں کی جو خبر چھپی تھی وہ بھیجا۔ وظیفہ پھر جاری ہو گیا۔ لیکن میں نے طے کیا کہ حیدرآباد کے شیعوں سے پھر کبھی ملوں گا نہیں۔ پھر میں نے اُن سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ اسی لیے جب شادی کی بات ہوئی تو سب کو حیرت ہوئی کہ یہ شیعہ ہے یا نہیں۔ انھیں کوئی جانتا نہیں۔

سوال : پھر سلیمان اریبؔ اور صفیہ نے مل کر شادی طے کی!

جواب : ہاں ان لوگوں نے اور ہمارے ایک دوست اورنگ آباد کے، جن کا میں نے ذکر کیا۔ نواب صاحب اب وہ ہم زلف بھی ہیں ہمارے۔

سوال : مذہب سے انحراف کی جو بات تھی۔۔۔؟

جواب : اسی وجہ سے ہم نے مجلس پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اُس کے ساتھ پھر مارکسزم کا اثر ہو گیا تھا۔ ترقی پسندی کا نظریاتی، فکری طور پر بھی، مذہبی فکر بھی۔

سوال : یہاں تک اثر ہوا کہ کسی صحیفے کو آپ نے ماننے سے انکار کیا؟

جواب : ہاں ایک زمانہ ایسا گزرا کہ جب ہم مذہب کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔

سوال : پھر دوبارہ واپس ہوئے؟

جواب : ہاں اُس کے بعد آہستہ آہستہ۔ ویسے مذہب سے سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا شعوری طور پر نہیں ہوا تھا۔ جو ردِّ عمل تھا وہ غیر شعوری تھا۔ حالات ویسے تھے لیکن بعد میں جب شادی ہوئی، بچے ہوئے۔ پھر مجلسوں میں جانا شروع کیا۔ مرثیے محفلوں میں پڑھے۔ ادھر ذاکری بھی دو سال سے لوگوں کے کہنے پر پھر سے شروع کی۔

سوال : اسی وجہ سے لوگ کہتے ہیں کہ آپ میں شیعیت ہے۔

جواب : ہاں ہے۔ شیعیت ہے (ہنسنے لگے)۔

سوال : لیکن مجھے آپ کے رویے اور سلوک سے ایسا کچھ نہیں لگتا۔

جواب : ایسا ضروری نہیں ہے۔ شیعیت الگ ہے اور انسانی تعلقات الگ۔

سوال : یہ شیعیت ہے کیا؟

جواب : شیعیت بس ایک مذہبی رویہّ ہے۔ اسلام کا ایک خاص اسکول ہے۔ اُس میں بعض عقائد ہیں۔ جس میں مجلس کو اور امام حسین کو اہمیت ہے۔

سوال : اُس میں تبرّہ بھی شامل ہے؟

جواب : ہاں، تبرّہ بھی شامل ہے۔ اسی لیے شیعہ تنقید بھی بڑی سخت کرتے ہیں۔

سوال : آپ تبرّہ میں بھی شامل ہیں؟

جواب : تبرّہ تو ہم خاصا شدید کرنے والوں میں ہیں۔

سوال : شعوری طور پر محسوس کرتے ہیں آپ؟

جواب : ہاں۔ ادب، شاعری، دوستی، دشمنی ہر چیز میں۔

سوال : ادب میں تو ٹھیک ہے۔ کیا اسے مذہب میں بھی جائز سمجھتے ہیں آپ؟

جواب : مذہب میں تو نہیں ہے۔ کئی اور چیزوں میں۔

سوال : اسکول کی تعلیم کے بارے میں کچھ اور بھی کہنے والے تھے آپ۔

جواب : اسکول میں ہمارے اصل مضامین تھے ریاضی اور سائنس۔ چناں چہ ریاضی میں ہمیشہ سو میں سو نمبر لیے اور ہاں اسکول کا امتحان جب دیا تو برابر پڑھ نہیں سکا تھا۔ اسی رات بڑے بھائی غائب ہو گئے تھے۔ صبح میں ریاضی کا پرچہ تھا۔ اُس میں اور اعلیٰ ریاضی میں جو اختیاری مضمون تھا سو میں سو نمبر آئے۔ سائنس میں بھی نوے فیصد آئے۔ والد چاہتے تھے کہ انجینئرنگ کروں لیکن والدہ نے کہا کہ جو بھی پڑھنا چاہوں پڑھوں۔ میں آرٹس پڑھنے کی طرف مائل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی مہینوں کی کشمکش کے بعد انٹرمیڈیٹ تو سائنس سے کر لیا اور انجینئرنگ میں داخلہ بھی مل گیا۔ لیکن بجائے انجینئرنگ کے آرٹس میں داخلہ لے لیا۔ آرٹس کے اُستادوں نے مخالفت کی۔ فلسفہ کے پروفیسر ولی الدین صاحب نے کہا کہ تم دیوانے ہو گئے ہو کہ انجینئرنگ چھوڑ کر فلسفے اور آرٹس میں آ رہے ہو جس میں تمھیں نوکری بھی نہیں ملنے والی ہے۔ میں نے کہا کہ دیکھا جائے گا۔ شاعری اور ادب کے چکر میں سائنس اور ریاضی چھوڑ دی۔ کبھی کبھی بلکہ اب تک بھی افسوس ہوتا ہے کہ اگر اُسی لائن میں رہتے تو ریاضی دان بن جاتے۔

سوال : میرا خیال ہے کہ آپ نے شاعری اور تنقید میں بڑا نام کمایا ہے۔

جواب : وہ بھی اس کے ساتھ چلتا۔

سوال : لیکن شاید اتنا نام نہیں کماتے۔

جواب : کہہ نہیں سکتے۔

سوال : آپ نے پروفیسر ولی الدین صاحب کا نام لیا۔ اُن کے ساتھ دیگر اساتذہ کون تھے۔

جواب : وحید الدین صاحب، صلاح الدین صاحب اور پروفیسر شیو موہن لال تھے۔ یہ

چاروں آدمی سینیئر لوگ تھے۔

سوال : عالم خوند میری صاحب سے کب ملاقات ہوئی۔

جواب : عالم صاحب نے مجھے نہیں پڑھایا۔ اُن سے ملاقات تھی ایک ادیب کی حیثیت سے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں۔ عالم صاحب نظام کالج میں بی اے تک پڑھاتے تھے۔ اور میں نے بی اے اور ایم اے آرٹس کالج سے کیا۔

سوال : آپ عالم صاحب سے متاثر تو رہے ہیں۔

جواب : لیکن اُن کا اندازہ تھا کہ میری عمر بڑی ہوگی۔ بڑی مشکل سے انھیں یقین دلایا۔ ایسا ہی پرکاش پنڈت کے ساتھ دلی میں ہوا۔ "شاہرہ" اور "فنکار" میں میری غزلیں، نظمیں اور تصویریں چھپتی تھیں۔ جب ملاقات ہوئی تو انھیں حیرت ہوئی کہ میں ابھی طالب علم ہوں۔

سوال : یہی معاملہ ابوالکلام آزاد کے ساتھ ہوا تھا۔ چلیے ہر بڑے آدمی کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ اب اپنے کچھ شعر سنائیں۔

جواب : اس کے بعد ڈاکٹر وحید اختر نے اپنے چند شعر سنائے۔ پہلے کے دو شعر پیش ہیں۔

وقت کی اُڑتی ہوئی ریت پہ لکھ دیتے ہیں لوگ
یہ زمیں میری یہ دیوار یہ در میرا ہے
قصر ہو یا کہ لحد دونوں کرائے کے مکاں
روز آ کر کوئی کہتا ہے یہ گھر میرا ہے

۱۹۹۸ء

❖

وحید اختر ___ اور ہم

وحید اختر سے میری ملاقات پہلی بار 1958ء میں ہوئی تھی اور جب وہ حیدرآباد سے آخری بار رخصت ہوئے تو وہ 1998ء کا سال تھا۔ گویا وحید اختر کی رفاقتیں کم و بیش چالیس سال تک میرے نصیب میں تھیں۔

وحید اختر کی معیت میں گزارے ہوئے کئی واقعات میرے ذہن پر نقش ہیں لیکن ایک اہم واقعہ ایسا ہے جسے میں پہلے رقم کرنا چاہوں گا۔

فروری 1981ء میں حیدرآباد کے چند احباب نے مل کر ایک سمینار "نذرِ عالم خوندمیری" منعقد کیا تھا۔ اس کے ڈھائی سال بعد عالم صاحب اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان دنوں پروفیسر اندرناتھ چودھری دلی سے نئے نئے آئے ہوئے تھے۔ وحید اختر تو سیمنار میں بہ نفسِ نفیس شریک تھے اور "اردو میں دانشوری کی روایت" پر انھوں نے اپنا مقالہ پڑھا تھا۔ چوں کہ سیمنار کے مقالوں پر چھپنے والی کتاب میں "ڈرامہ" کی صنف پر کوئی مضمون شامل نہیں تھا اس لیے سیمنار کمیٹی نے پروفیسر اندرناتھ چودھری سے اس موضوع پر ایک مضمون حاصل کیا اور کتاب میں شامل کرلیا۔ اسی زمانے میں اندرناتھ چودھری اور وحید اختر کا ایک دوسرے سے پہلی بار تعارف ہوا تھا۔ میرے لیے اہم واقعہ یہ تھا کہ تعارف کے بعد جب وحید اختر جاچکے تو اندرناتھ چودھری نے مجھ سے پوچھا:

"وحید اختر کی شباہت عالم خوندمیری صاحب سے ملتی جلتی ہے۔ گھنی زلفیں، کشادہ ماتھا، ستواں ناک، چمکتی اور بولتی ہوئی آنکھیں، کیا یہ بھی عالم صاحب کی اسکالرشپ اور ذہانت کی ٹکر کے آدمی ہیں؟"

میں نے جواب دیا تھا "دونوں کا مقابلہ تو میں نہیں کروں گا لیکن وحید اختر فلسفہ اور اردو زبان کے ایک اہم اسکالر ہیں، اچھے شاعر اور بلند پایہ نقاد ہیں۔ ان سے ملتے ہوئے بعض لوگ گھبراتے بھی ہیں۔ کوئی کج بحثی پر اتر آئے تو اسے ہرگز نہیں بخشتے اور ہاں وہ اپنے لیے "میں" کے بجائے "ہم" کا استعمال کرتے ہیں۔ بعض ایسی ہی صفات کی وجہ وہ ہم لوگوں میں مقبول بھی ہیں۔ میں انھیں اپنے چہیتے دوستوں میں شمار کرتا ہوں"۔ حالاں کہ پہلی ہی ملاقات میں وحید اختر نے جو تاثر مجھ پر چھوڑا تھا وہ کوئی خوشگوار نہ تھا۔ اورینٹ ہوٹل، عابد سے چائے نوشی کے بعد چند احباب باہر نکلے اور اپنے اپنے گھروں کی راہ لی تو میں اور وحید اختر ساتھ ہو گئے کہ دونوں کو ایک ہی راستے جانا تھا۔ وحید اختر مجھے پان کے ڈبے پہ لے گئے اور دو بیڑوں کا آرڈر دیا۔ میری طرف دیکھا اور کہنے لگے "جانتے ہو پان کی سرخی کہاں کام آتی ہے" پھر ان کے ہونٹوں پر ایک تیکھی سی مسکراہٹ آئی۔ میں نے ان کی طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا تو وہ اپنے ہونٹوں کو پھیلا کر پان کا بیڑہ منھ میں رکھ رہے تھے۔ جب ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور میں ان کے "ہم" سے اچھی طرح واقف ہوا اور سلیمان اریبؔ کے رسالہ "صبا" میں ان کے مضامین "سخن گسترانہ بات" کے عنوان سے پڑھتا رہا تو ان جانے طور پر ان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ پھر کبھی بھی میرا دل ان کی طرف سے میلا نہ ہوا باوجود یہ کہ کچھ واقعات ایسے پیش آتے رہے کہ عام حالات میں انھیں معاف کرنا میری اخلاقی کمزوری ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک رات دوستوں کی محفل برخاست ہونے پر ہم گھروں کو لوٹے تو مجھے اپنی کار میں وحید اختر کو ان کے سسرالی مکان اعظم پورہ پر پہنچانا تھا۔ میرے گھر کے راستے ہی میں پڑتا تھا۔ کار سے اترنے کے بعد بھی وہ دیر تک ٹھیرے رہے۔ رات بہت ہو چکی تھی۔ میں نے

اصرار کیا تو وحید اختر نے مجھے کارنشین کا طعنہ دیتے ہوئے کار کے پٹ کو اس جھٹکے سے بند کیا کہ پٹ کی چولیں ڈھیلی پڑ گئیں۔اس رات خدا خدا کر کے مجھے کسی طرح ان سے پیچھا چھڑانا پڑا۔اس واقعے کی تلخی شاید زیادہ دنوں تک میرے ذہن پر رہتی لیکن دو دن بعد وحید اختر سے جب میری ملاقات ہوئی تو انھیں سرے سے یاد ہی نہ تھا کہ انھوں نے اس رات کیا حرکت کی تھی۔ایک دوسری رات میں انھیں مغنی تبسم صاحب کے گھر سے واپس لا رہا تھا راستے میں وحید اختر نے کہا کہ نظام کلب جانا ہے۔وہاں غلام الصادقین ٹھیرے تھے۔اس رات مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی لیکن صادقین صاحب سے ملنے کے اشتیاق سے زیادہ ایک دوست کو ناراض نہ کرنے کا مسئلہ تھا۔راستے میں وحید اختر نے شراب خریدی اور ہم دونوں نظام کلب گیسٹ ہاوز پہنچے۔وحید اختر کا نام سنتے ہی صادقین نے کمرے کا دروازہ کھلوایا اور پھر ایک بار پینے پلانے کی محفل جمی۔وحید اختر اصرار کرتے رہے کہ انھوں نے جو شراب لائی ہے وہ پی جائے۔لیکن صادقین اپنے اصول کے پکے تھے۔ان کے ساتھ جو نوجوان ساقی تھے انھوں نے ایک پوری بوتل اندر سے لائی اور اسی میں سے شراب کو گلاسوں میں انڈیلا گیا۔اب وحید اختر کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔انھیں زعم تھا کہ صادقین ان کے تحفے کو ٹھکرا نہیں سکتے میں نے چپکے سے کہا کہ دیکھیے صادقین کو کیا معلوم کہ ان کا کون دوست ہے اور کون دشمن۔وہ باہر سے لائی ہوئی شراب کیوں استعمال کریں۔ وحید اختر نے کہا'' آپ چپ رہیے آپ کیا جانتے ہیں ہمارے مراسم کیا ہیں'' پھر وہ صادقین کو ڈیڑھ دو گھنٹے تک زچ کرتے رہے کہ'' ہم آپ سے زیادہ زمانے میں مشہور آدمی ہیں۔بڑے شاعر' عالم و نقاد ہیں' فلسفے کے پروفیسر ہیں۔اردو کی ساری دنیا ہمارا احترام کرتی ہے۔آپ ایک معمولی نقال ہیں۔خطاطی کی نقل کرتے ہیں۔آپ کو یہ اعزاز ہم نے بخشا کہ ہمارے شعری مجموعے'' زنجیر کا نغمہ'' پر آپ کا ٹائٹل قبول کر لیا۔ہم نے آپ پر احسان کیا ہے۔'' صادقین بے چارے'' ہاں ہوں'' کرتے رہے' نہ تو ان کی اور نہ ہی ان کے مصاحبوں کی پیشانی پر بل آیا۔میں خفت سے گڑا جا رہا تھا کہ وحید اختر کے ساتھ کیوں

آیا۔میں انھیں وہیں چھوڑ کر چلا جاتا۔دو ایک بار اٹھنے کی کوشش بھی کی لیکن وحید اختر میرا ہاتھ پکڑے رہے۔ناچار میں کڑھتا رہا۔میری قسمت میں وحید اختر کے ساتھ ایک اور شب کا واقعہ بھی لکھا تھا۔دونوں ایک رات دیر سے ان کے گھر پہنچے۔انھوں نے آواز دے کر اپنی رفیقِ حیات مہ لقا کو بلایا۔وہ گیٹ کا دروازہ کھولے کھڑی رہیں۔میں اپنی کار میں بیٹھا رہا کہ وحید اختر اندر چلے جائیں تو میں نکل پڑوں۔آج بھی یہ سوچ کر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ مہ لقا کی نعش کی کھوج میں اس سمندر کے کنارے سارا دن بیٹھے رہے جس سمندر میں امریکیوں نے ایرانی ہوائی جہاز کو مار گرایا تھا اور پھر ان کی یاد میں ایسی شاعری کی جسے ان کی عمدہ تخلیقات میں شمار کیا جائے گا۔غزل کا ایک شعر ہے۔

وقت بھی سعیٔ مداوائے الم کر نہ سکا

جب سے تم بچھڑے ہو خود وقت ہے ٹھہرا ٹھہرا

اس رات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وحید اختر نے مہ لقا سے عقد کے بعد جو کلفتیں اٹھائیں تھیں ان کا اعادہ کرنا اور اس کا بدلہ چکانا چاہتے تھے۔مہ لقا سے میری ملاقاتیں بہت کم ہوئی تھیں لیکن اس رات کے بعد وہ مجھے پھر کبھی نظر نہ آئیں۔ان کی آواز تک سنائی نہ دی۔یہاں تک کہ مخدوم ایوارڈ کے سلسلے میں اختر حسن صاحب (مرحوم) اور میں علی گڑھ گئے اور صبح صبح دلی سے ٹرین کے ذریعے پہنچے تو وحید اختر' ان کے برادر نسبتی اور گھر والوں کے لیے ناشتہ نکالا جا چکا تھا۔جوں ہی ہم لوگ پہنچے وحید اختر نے ہم سے ملاقات کی لیکن بلاوا آیا تو وہ فوراً اندر گئے۔باہر نکلے تو کہا'' آپ لوگوں کے لیے ناشتہ رکھا ہے۔آج ہم لوگ مہمان جا رہے ہیں۔آپ لوگوں سے کل ملاقات ہوگی۔'' مجھے یاد نہیں کہ ہم لوگوں نے ناشتہ وہاں کیا تھا یا نہیں۔اس کے بعد ہم لوگ شہریار کے گھر گئے اور اسی دن شام کو دلی لوٹ آئے۔

علی گڑھ شہر کا ایک دوسرا واقعہ بھی مجھے خوب یاد ہے۔ان دنوں قرۃ العین حیدر صاحبہ علی گڑھ میں وزیٹنگ پروفیسر تھیں۔وحید اختر مجھے اپنے ساتھ لے اردو ڈپارٹمنٹ پہنچے۔قرۃ العین

حیدر نے ہم دونوں کو تپاک سے بٹھایا اور باتیں شروع کیں۔ وحید اختر کی جو باتیں یاد رہ گئیں وہ کچھ اس طرح کی تھیں۔ ''ہم نے آپ کے ناول آگ کا دریا کو ایک بڑے ناول کی حیثیت سے اردو دنیا میں واقف کروایا۔ شعور کی رو کو ہم نے جس طرح سے پیش کیا کوئی دوسرا نہ کرسکتا تھا۔ ہماری وجہ سے آپ کے ناول کو بڑی شہرت ملی۔'' مزے کی بات تو یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے کسی بات کی تردید نہ کی۔ ورنہ ان کی شہرت تو یہ ہے اور جس کا ایک چھوٹا سے تجربہ ان کی حیدرآباد کی آمد کے موقع پر ہوچکا تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو تو وہ چپ نہیں رہتیں۔ ان کا احتجاج کچھ زیادہ شدید ہی ہوتا ہے۔

ابھی تک تو میں ''ہم'' والی باتیں بیان کررہا تھا اب کچھ پر بیتی بھی ہوجائے۔ وہ میری افسانہ نگاری کا ابتدائی دور تھا۔ چار افسانے ''صبا'' میں چھپے تھے اور ایک چھوٹی سی کتاب کو جو نو افسانوں پر مشتمل تھی مغنی تبسم صاحب نے شائع کروائی تھی۔ اس کے چند ہی دنوں بعد وحید اختر حیدرآباد آئے تو مجھ سے کہا ''اس دفعہ آپ اپنے افسانوں کی کتاب کی رسم اجرا ہم سے کراویئے۔ ہم آپ کو اسٹابلش (Establish) کرکے جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ وحید اختر جب بھی اسٹیج سے کسی موضوع پر تقریر کرتے تو وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ موثر ہوتی۔ سوائے عالم خوندمیری صاحب کے وہ کسی بھی مقرر کے مقابلے میں اپنی تقریر کا لوہا منوالیتے۔ میں انھیں مختلف موقعوں پر سن چکا تھا۔ تاہم میں نے کہا۔ وحید اختر صاحب کتاب کی رسم اجرا کوئی بھی بڑا آدمی کرے اور کیسا ہی شان وشوکت کا جلسہ ہو کتاب کی اصلیت تو اس کی تخلیقات میں بولتی ہے۔ بڑا فن پارہ اپنی راہ آپ تلاش کرلیتا ہے۔ کہنے لگے ''نہیں جناب! وہ دور چلا گیا جب فن کاروں کی کمی تھی، اب تو اچھے اچھے فن کار دفن ہوکر رہ جاتے ہیں۔'' پھر میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا انھوں نے کافکا کو پڑھا ہے۔ کہنے لگے صرف تین چار صفحات سے آگے نہ پڑھ سکا۔ ''اگر علامت اور تجرید سے آپ کو رغبت نہیں ہے تو پھر جدید فن پاروں کی پذیرائی آپ کیسے کریں گے؟'' میرے اس ریمارک پر بھنا اٹھے۔ کہنے لگے۔ ''احمق اور جاہل

ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ علامت اور تجرید سے مجھے بیر ہے۔ ترقی پسند تحریک کی اگر ہم نے حمایت کی ہے تو ہماری ہمدردی پس ماندہ اور پچھڑے ہوئے طبقے سے ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی بھی ترقی پسند ادیب کی میں حمایت کروں اور جدیدیت کو برا بھلا کہوں۔'' پھر میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا ''یہ تو بتایئے آپ میں یہ تلخی کیسے آئی۔ کسی کو بھی اس کے منھ پر احمق اور جاہل کہہ دیا۔ تم کیا جانو ادب کیا ہے' شاعری کیا ہے اور بعض وقت تو اچھے خاصے لوگوں کی بھی آپ نے دل آزاری کی ہے۔''

اس پر میری طرف غور سے دیکھ کر کہنے لگے۔ ''پھر آپ نے چھیڑا۔ ہم آپ سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ 'پیدا ہونے کے بعد سے بڑے ہونے تک' شاعری میں نام کمانے اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے تک دنیا نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ان لوگوں میں ہمارے عزیز اور رشتہ دار بھی شامل تھے۔ ایک دفعہ ہم اپنے گھر کے لیے پڑوسی کے نل سے پانی بھر رہے تھے۔ پڑوسی کوئی غیر نہیں تھے ہمارے رشتہ دار تھے۔ ہمارا حال تھا اونچا پاجامہ اور بوسیدہ قمیض' پاؤں میں پھٹی چپل۔ وہاں حیدرآباد سے کچھ شاعر بھی آئے ہوئے تھے اور شعری محفل جمی ہوئی تھی۔ نل پر پانی کا بکٹ چھوڑ کر ہم بھی شعر سننے کے لیے قریب پہنچے اور چبوترے ہی پر کھڑے رہے۔ کسی اور نے نہیں ہمارے رشتہ دار ہی نے کہا 'شاعری تمھاری کیا سمجھ میں آئے گی۔ جاؤ اپنا پانی بھرلو' اس کے بعد بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ہماری شہرت شاعر کی ہوگئی۔ دارالشفا کی ایک شعری محفل میں ہمیں بھی مدعو کیا گیا۔ جن صاحب نے طعنہ دیا تھا کہ شاعری میری سمجھ میں نہیں آئے گی انھوں ہی نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا۔ 'میں تو صرف آپ کی شاعری سننے کے لیے آیا ہوں'۔ میں ان سے کیا کہتا 'شاعری یوں ہی نہیں آتی جناب۔ وہ تو ودیعت ہوتی ہے۔' لیکن میں نے انھیں سنا ان سنا کردیا اور اسٹیج پر چلا گیا۔''

سچ پوچھیے تو تلخی کے علاوہ بہت سی صفات وحید اختر کو ودیعت ہوئیں تھیں۔ تلخی تو انھوں نے اپنے پر لادلی تھی۔ یہ تو نہیں کہتا کہ وہ دنیا کو وہی تلخی لوٹانا چاہتے تھے جو دنیا نے

انھیں دی تھی میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک بے ریا شخصیت کے حامل انسان تھے۔ تو پھر کیا یہ انا پرستی تھی؟ میں کہوں گا یہ بھی نہیں۔ بہت سی نفسیاتی الجھنیں ہوتی ہیں، بڑی ہی پیچیدہ۔ خود انسان ان سے واقف نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو اسے ایک معمول (Routine) سمجھ کر اس پر عمل کرتا رہتا ہے۔ وحید اختر کا معاملہ یہ نہیں تھا کہ وہ دوسروں کو کم تر سمجھنا چاہتے تھے بلکہ وہ اپنے کو کسی سے کمتر کہلانا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے کہ وہ اپنی بلند حیثیت سے باخبر تھے۔ اردو ادب نثر ہو کہ نظم یا تنقید انھوں نے کبھی تیسرے درجے کی تخلیق نہیں کی۔ ابتدائی تعلیم اردو میڈیم سے ہونے کے باوجود انگریزی اس طرح سے بولتے جیسے کسی انگریزی میڈیم کا طالب علم بولتا ہے۔ فارسی زبان پر بھی عبور تھا۔ بلا کا حافظہ سونے پر سہاگے کا کام کر جاتا۔ نطق کی ان کے پاس بڑی اہمیت تھی۔ خاموش رہنے والوں کو وہ منافق اور خود غرض جانتے تھے۔ ''کربلا تا کربلا'' ان کی شاعری کا آخری مجموعہ ہے۔ اس موضوع پر ان کی ایک طویل نظم ہے۔ میں ان کی ایسی محفلوں میں بھی شریک رہا جہاں انھیں مرثیہ سنانے کے لیے مدعو کیا جاتا۔ غزل ہو نظم ہو کہ مرثیہ' شعر سنانے میں ایک ایسا بانکپن تھا جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتا ہے۔ باتیں بھی طویل ہوتیں مضامین بھی طویل ہوتے اور خطوط بھی طویل لکھتے۔ پہلے بھی طویل خطوط آتے رہے اور پھر اس وقت بھی جب ان کے بڑے لڑکے حسن کو دیسی پستول کے قبضے میں رکھنے کے الزام میں چادر گھاٹ پولیس نے حراست میں لے لیا تھا۔ علی گڑھ کے طالب علموں کے پاس پستول کا ہونا معمول کی بات تھی لیکن سوال یہ تھا کہ علی گڑھ کا طالب علم پستول کے ساتھ حیدرآباد کیوں آیا۔ تحقیق پر جب پولیس کو پتہ چلا کہ طالب علم امن پسند اور پڑھے لکھے گھرانے کا ہے اور سابق میں کوئی مجرمانہ رکارڈ نہیں ہے تو معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ میرے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ وحید اختر نے بڑی سفارشوں تک پہنچ رکھتے ہوئے بھی مجھ پر اعتماد کیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ دوستوں کا اعتماد آدمی کے بھرم کو بڑھا دیتا ہے۔

دلی کی ایک ادبی محفل میں اردو ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات پر ایک مذاکرہ تھا۔

علی سردار جعفری جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ اتفاق سے میں اس محفل میں موجود تھا۔ وحید اختر نے جدیدیت کے خلاف چند باتیں کہی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ میں ادب میں علامت اور تجرید کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ اس کے باوجود میں نے ان سے خواہش کی کہ میں کچھ بولنا چاہتا ہوں تو انھوں نے صدر جلسہ سے سفارش کی۔ میں نے وحید اختر کے ارشادات کے خلاف باتیں کیں۔ صدر جلسہ نے وحید اختر سے سرگوشی میں کہا ''یہ تو آپ کے خلاف بول رہے ہیں۔'' اس وقت تو وحید اختر کا چہرہ بڑا سنجیدہ ہو گیا تھا لیکن جلسے کے اختتام پر مجھ سے مل کر کہنے لگے ''یہی توقع تھی جناب آپ سے۔'' یہ کہہ کر وہ ہمیشہ کی طرح مسکرانے لگے۔

آخری بار وحید اختر جب حیدرآباد آئے تو کوئی ڈیڑھ ماہ کا قیام رہا۔ گردوں کا عارضہ تھا۔ تقریباً روز ہی انھیں ڈائلائسس کے لیے دوا کا ایک نیا پیاکٹ استعمال کرنا پڑتا تھا۔ دواخانے کی سہولت کی وجہ میرے پاس ہی قیام تھا۔ گراؤنڈ فلور پر میری بیگم کا دواخانہ تھا اور ہم لوگ پہلی منزل پر رہتے تھے۔ وحید اختر نے ایک ایسا کمرہ منتخب کر لیا جہاں بیٹھ کر وہ کچن گارڈن کا نظارہ کر سکتے تھے۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں عالم خوندمیری صاحب نے اپنی بیماری کے دوران تین دنوں کے لیے قیام کیا تھا۔ ان کے گردے بھی ناکام ہو رہے تھے۔ مکان بدل رہے تھے تو انھیں دو چار دن کے لیے ایسی جگہ کی ضرورت تھی جو شور شرابے سے پاک ہو۔ میرے پاس سے منتقل ہو کر ایک ہفتہ بعد ہی مہاور ہاسپٹل میں اپنی آخری سانس لی تھی۔ سب لوگ یہ جانتے تھے کے وحید اختر بھی چند ماہ کے مہمان ہیں۔

کسی بھی شخص کے لیے یہ ایک بھیانک تجربہ ہے کہ اسے اپنی موت سے قریب ہونے کا علم ہو جائے لیکن یہ نہ معلوم ہو کہ کتنے دن تک اس کی حیات باقی ہے۔ ہر روز اگلے دن کی امید و بیم میں جینا پڑتا ہے۔ سلیمان اریبؔ' عالم خوندمیری' عزیز قیسیؔ اور اختر حسن ان چاروں احباب سے میری قربت بھی تھی اور محبت بھی۔ میں ان احباب کو ایسے ہی دور سے گزرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ چاروں اپنے اپنے رویے میں مختلف تھے۔ وحید اختر جو اپنے

آپ کو احباب کے درمیان اکثر غیر محفوظ سمجھتے رہے ہوں اور لوگوں کو بولنے کا موقع نہ دیا ہو ان دنوں نسبتاً خاموش رہا کرتے لیکن کسی بھی ملنے والے کو یہ احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ زندگی سے مایوس ہیں یا انھیں اس کا غم ہے۔ احباب ملنے آتے تو ان سے علم وادب، شعروشاعری کی باتیں ہوتیں یا پھر علی گڑھ اور حیدرآباد کے ادبی ماحول کی باتیں۔ کبھی کبھی ایران میں اپنے قیام کے دنوں کو بھی یاد کرتے اور وہ واقعات سناتے جن کا انھیں تجربہ تھا۔ انھیں دنوں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ تاریخ کے استاد علی محسن صاحب کی ایک کتاب ''تاریخِ یورپ۔ دورِ جدید'' چھپ کر آئی تھی۔ علی محسن صاحب کے صاحب زادے ڈاکٹر جعفر حسن نے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اس کتاب پر کسی طرح وحید اختر کا تبصرہ حاصل کرلیا جائے۔ میرے لیے یہ سب سے زیادہ کٹھن کام تھا۔ پہلے اس کتاب کو میں نے وحید اختر کو پڑھنے کے لیے دیا تھا لیکن فرمائش کرنے سے کتراتا رہا۔ کسی طرح ہمت کرکے ایک دن مدعا ظاہر کردیا یہ کہتے ہوئے کہ اس کتاب کی اشاعت میں میری بھی محنت ہے۔ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ وحید اختر نے جواب دیا ''ہاں میں اس پر تبصرہ لکھوں گا۔ کتاب بہت اچھی چھپی ہے اور علی محسن صاحب کی زبان کا میں دل دادہ ہوں۔'' اس کے تیسرے ہی دن انھوں نے دو صفحات پر مشتمل ایک مبسوط تبصرہ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ چار سو صفحات پر پھیلے ہوئے متن کو جیسے کوزے میں بند کردیا ہو۔ یہ تھا ان کا رویہ زندگی سے، علم وادب سے اور دوست احباب سے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی دوست نے کوئی فرمائش کی ہو اور انھوں نے انکار کیا ہو۔

وحید اختر کے حیدرآباد سے واپسی سے قبل ایک ادبی محفل کا اہتمام کیا گیا۔ ان کے علی گڑھ واپس ہونے سے دو دن قبل ان کے کمرے کے سامنے لان پر چند احباب کو مدعو کرلیا گیا۔ مرحومہ صفیہ اریبؔ اور مرحوم سید عبدالقدوس بھی موجود تھے۔ جو احباب حیات ہیں میں ان کے نام لینے سے گریز کررہا ہوں کہ اگر کسی صاحب کا نام چھوٹ جائے تو مجھے اس کی

ندامت ہوگی۔ بہر حال کوئی پچیس تیس احباب شریکِ محفل رہے۔ شاعروں نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ دوسروں نے باتیں کیں۔ وحید اختر نے اچھی اچھی باتیں کیں اور اپنے کلام سے بھی نوازا۔ علی گڑھ روانہ ہونے سے ایک دن قبل وحید اختر نے مجھے یہ کہہ کر چونکا دیا کہ ''جناب آپ نے جو مہمان نوازی کی ہے اس کا تو احسان رہے گا۔ (حالاں کہ ان کا کھانا ان کے رشتہ داروں کے پاس سے ہی آیا کرتا) لیکن دواخانے کے کمرے کا کرایہ آپ کو لینا ہوگا۔ پھر انھوں نے دواخانے کی سسٹر کو بلاکر بڑے اصرار کے ساتھ وہ پیسے دے دیے۔ انا پرست تو وہ تھے ہی لیکن بعض احباب نے ان پر خود پرستی کا بھی الزام لگایا۔ میں نے ان کی تمام اداؤں کو بڑے احترام سے یاد رکھا ہے۔ جس شخص کا سارا بچپن غربت وافلاس میں گزرا ہو، جسے لوگوں کی شفقت ومحبت کبھی حاصل نہ ہوئی ہو اور جسے اپنی ہی یونیورسٹی میں (Merit) میرٹ کے باوجود ملازمت نہ ملی ہو جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، کسی کو کبھی دھوکہ نہ دیا ہو، جس نے بھوکے رہنے کو قرض مانگنے پر ترجیح دی ہو، جس نے وقت اور وعدے کی پابندی کی ہو اور جو کبھی کسی دولت مند اور صاحبِ اقتدار سے مرعوب نہ ہوا ہو، وہ جو ہمیشہ بے باک اور حق گو رہا تو ایسے شخص کو اپنی بڑائی منوانے کا حق ہے۔ انھوں نے اس حق کا بھرپور استعمال کیا۔ کسی کو حقیر نہ جانا بلکہ اپنے ''ہم'' میں ہم لوگوں کو بھی شامل سمجھا، اپنے رتبے سے بہ خوبی واقف تھے اور آخری وقت تک اس کے وہ محافظ رہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے کو حیدر علی آتش کا ہم نوا بنالیا تھا۔

غم نہیں گوائے فلک رتبہ ہے مجھ کو خار کا
آفتاب اک زرد پتاّ ہے مرے گلزار کا

•❖•

بزم ارباب نظر (سوانحی انشائیے)

تبصرے

اے سب رس، حیدرآباد جون ۲۰۰۸ء

نقد و نظر

'بزم اربابِ نظر' قدیرزماں کے تیرہ سوانحی انشائیوں یا خاکوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف شخصیتوں پر لکھے ہیں، یہ خاکے محض ادیبوں یا شاعروں تک مخصوص نہیں ہیں بلکہ زندگی کے سفر میں مصنف کو جن لوگوں سے ملنے یا متاثر ہونے کا اتفاق ہوا ہو ان کے تعلق سے اپنے تاثرات اس میں قلم بند کیے ہیں۔ آدمی جب کسی کا خاکہ لکھتا ہے تو خود لکھنے والے کی سوچ، اس کا ظرف یا عالی ظرفی، مزاج کی کیفیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ شاید قدیرزماں کا ارادہ کتاب کا دیباچہ لکھنے کا نہیں تھا، جب کتاب دیباچے کے بغیر چھپ کر آگئی تو بعض احباب نے ان کو توجہ دلائی کے مصنف کا اور ممدوحین کا کتاب میں کوئی تعارف نہیں ہے۔ قدیرزماں نے اس اعتراض کو دور کرنے کے لیے ایک صفحہ کا ضمیمہ یا پس نوشت شامل کیا ہے۔ قدیرزماں نے بڑے انکسار سے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے، ان کے افسانوں کے دو مجموعے، ڈراموں کے دو مجموعے، اقبال پر ایک کتاب اور تصوف کے موضوع پر ایک کتاب شایع ہوئی ہے، کچھ ترجمے اور اُردو اور انگریزی کے چیدہ چیدہ مضامین شایع ہوئے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ بھی اچھا خاصا ادبی کارنامہ ہوا لیکن مصنف نے محض دوسروں کے اصرار پر لب کشائی کی ہے۔ مصنف نے مزید عجز و انکسار سے کام لیتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ

مضامین کی نوک پلک وہاب عندلیب صاحب نے درست کی ہے اور کتاب کا نام پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے تجویز کیا ہے۔

یہ خاکے جس انداز سے لکھے گئے ہیں ان سے مصنف کی شرافت اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ انگریزی کے پروفیسر آئزک سیکویرا کا خاکہ کتاب کے شروع میں دیا گیا ہے، آئزک سیکویرا نے انٹرمیڈیٹ تک اُردو بہ حیثیت ثانوی زبان پڑھی تھی، وہ بہت اچھی اُردو بولتے تھے اور اُردو کتابیں شوق سے پڑھتے تھے، بہت ہی فراخ دل انسان تھے اور ان کے دل میں ہر ایک کے لیے نرم گوشہ تھا۔ اپنے شاگردوں کی مدد کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ قدیر زماں نے بڑا اچھا تاثراتی خاکہ سیکویرا صاحب کے بارے میں لکھا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے ایک بات کا پتہ چلتا ہے کہ خود قدیر زماں کی مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ۱۹۶۰ء کے آس پاس شروع ہوئیں۔ اکثر مضامین میں ۱۹۶۰ء کا ذکر بہت زیادہ ہے۔ بعض باتیں تحقیق طلب ہیں، مثلاً قدیر زماں نے لکھا ہے کہ ۱۹۶۰ء میں عابد روڈ پر بگھیاں اور تانگے چلتے تھے اور سڑکوں پر پانی کا چھڑکاؤ ہوتا تھا۔ مصنف نے لکھا ہے کہ دن کے وقت بھی آمد و رفت بہت کم رہتی تھی اور راتوں میں تو سناٹا ہوتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۶۰ء میں اچھی خاصی ٹریفک رہتی تھی البتہ یہ بات ۱۹۳۰ء کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ (کتاب کے صفحہ ۱۱ پر میں نے لکھا ہے ''بیسویں صدی کے چھٹے دہے میں جب گرمیوں کا موسم ہوتا تو عابد روڈ پر پانی کا چھڑکاؤ ہوا کرتا۔ کبھی کبھی تانگے اور بگھیار، چلتیں تو سڑکوں کی صفائی ہوتی۔ راتوں میں تو اکثر سناٹا ہی ہوتا۔'' یہی میرا مشاہدہ ہے۔ ۱۹۵۳ تا ۱۹۵۷ء میں جس آفس میں کام کرتا تھا وہ عابد شاپ پر ہی تھا۔ تبصرہ نگار نے چھٹے دہے کو غلطی سے ۱۹۶۰ء کے بعد کی دہائی سے تعبیر کیا ہے، جبکہ اسے ۱۹۵۰ء کے بعد ہی سے شمار کیا جائے گا''۔ (ق۔ز)

یہ بات تو برسبیل تذکرہ آ گئی، اس کتاب کے چند بہت اچھے خاکوں میں سے ایک خاکہ احمد جلیس کا ہے، احمد جلیس کے خلوص، شرافت اور ان کی ریڈیو کے لیے خدمات کا بہت

اچھا جائزہ ہے، ساتھ ہی ان کی شخصی زندگی کے بعض پہلوؤں کو نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

پروفیسر سید سراج الدین پر جو خاکہ لکھا گیا ہے اس کی تکنیک میں افسانوی رنگ ہے، سراج صاحب کو فطرت سے گہرا لگاؤ تھا، شاید اسی پس منظر میں قدیر زماں نے کویل کے کُوکنے کا تذکرہ ایسے انداز میں کیا ہے، جس سے خاکہ میں اثر انگیزی پیدا ہوگئی ہے۔

انڈوں کے مشہور تاجر شیخ امام صاحب سے مصنف کو اپنی عملی زندگی کی ابتداء میں ربط قائم ہوا تھا، شیخ امام صاحب نے انھیں سہارا دیا تھا۔ قدیر زماں نے فراخ دلی اور شکر گزاری کے جذبات سے شیخ امام کو خراج پیش کیا ہے۔

عالم خوندمیری بلاشبہ ایک عالم آدمی تھے، ان کی تحریروں میں ندرت اور نکتہ آفرینی ہوتی تھی۔ قدیر زماں نے عالم صاحب کو ایک کتاب سے تشبیہ دی ہے اور یوں لگتا ہے کہ قدیر زماں کے مضمون کے آخری پیراگراف میں عالم صاحب کی پوری شخصیت سمٹ آئی ہے۔ اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنا یا اپنے ماضی سے آنکھیں نہ چُرانا بھی عالی ظرفی کی دلیل ہے۔ قدیر زماں نے اپنے بارے میں بڑی صفائی سے لکھا ہے کہ وہ تلنگانہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے آئے ہوئے ایک غریب لڑکے کی طرح تھے۔ (میں نے اپنے بارے میں کہیں ایسا جملہ نہیں لکھا ہے......ق۔ز) قادر علی بیگ کے حُسنِ سلوک اور دل جوئی کا بھی انھوں نے صدق دل سے اعتراف کیا ہے۔

اس کتاب کا سب سے اچھا خاکہ وہ ہے جو 'چیزے دیگر است' کے عنوان سے مغنی تبسم پر لکھا گیا ہے، اگر چہ یہ خاکہ بعض پرانے مضامین کے اقتباسات کو جوڑ کر لکھا گیا ہے لیکن اپنی جگہ نہایت مکمل اور خوب صورت ہے اور اس خاکے سے مغنی تبسم کو سمجھنے میں یقیناً مدد ملتی ہے۔ وحید اختر، وہاب عندلیب اور ہاشم علی اختر کے خاکے بھی اچھے ہیں۔ کتاب اچھی چھپی ہے، اس کی قیمت = ۱۵۰/ روپے ہے اور اسے مصنف کے مکان 16-10-49 ملک پیٹ، حیدرآباد کے علاوہ 'سب رس کتاب گھر' سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سید امتیاز الدین

۲۔ ہماری زبان ۱۴ را اگست ۲۰۰۸

نئی کتابیں

قدیر زماں کی شہرت افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار کی ہے لیکن انہوں نے 'تلاشِ اقبال' جیسی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ادھر دو برسوں میں ان کی دو کتابیں ''تصوف بہ یک نظر'' اور ''بزمِ ارباب نظر'' منظر عام پر آئی ہیں۔ اس وقت ہمارے پیش نظر جو کتاب ہے اسے سوانحی انشائیے کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے رشید احمد صدیقی اور فرحت اللہ بیگ کے خاکوں کے علاوہ خلیق انجم کا 'استاد رسا' اور عبدالحق کا مالی 'نام دیو' یاد آگئے۔ قدیر زماں نے اپنی تحریروں کو خاکوں کے بجائے انشائیے شاید اس لئے کہا ہے کہ ان میں طنز و مزاح بالکل نہیں ہے۔ زبان نہایت ہی سلیس ہے۔ تخیل کے ساتھ اسلوب انشائیوں کا ہے۔ اپنے دوستوں کی خوبیاں ہی خوبیاں بیان کی ہیں۔ چند دن قبل اردو گھر حمایت نگر میں اس کتاب پر ایک ادبی محفل میں گفتگو ہوئی تو مجھے بھی اس محفل میں شرکت کا موقع ملا۔ جیلانی بانو، بیگ احساس، مظہر مہدی، محمد عبدالمقیت، محمد علی بیگ، احمد رضوی اور چند دیگر احباب نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ان احباب کو سن کر اور کتاب پڑھ کر میرا یہ یقین پختہ ہوگیا کہ سارے سوانحی واقعات نہایت شریف انسانوں پر لکھے گئے ہیں۔ وہ جو مرحوم ہو چکے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کتبہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ جو ابھی حیات ہیں ان کے لئے قدیر زماں نے اپنا سپاس نامہ پیش کیا ہے۔

جملہ تیرہ انشائیے ہیں۔ ممدوحین میں مختلف مذاہب اور مکتبہ خیال سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ ایک طرف سید عالم خوندمیری، مغنی تبسم، آئزک سیکویرا، سید سراج الدین، وحید اختر جیسے عالم و فاضل لوگ ہیں، تو دوسری طرف ایم راما کرشنیا (آئی اے ایس)، شیخ امام تاجر، نرسنگ راؤ سیاست داں کے علاوہ وہاب عندلیب، ہاشم علی اختر، رفیعہ سلطانہ جیسے درس وتدریس سے وابستہ مشاہیر بھی ہیں۔ مزید قادر علی بیگ اور احمد جلیس جیسے ریڈیو/ ٹی وی اور ڈرامہ سے وابستہ فن کاروں کے

کارنامے ان کی مختصر سوانح کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب سے اقتباسات پیش کرنے کے بجائے اس قدر عرض کرنا چاہوں گا کہ جب بھی دنیا ان لوگوں کو یاد کرے گی، اس کتاب کا حوالہ ضرور دیا جائے گا۔ اسے فورم کے پتہ کے علاوہ سب رس کتاب گھر حیدرآباد سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

زین العابدین

۳۔ کے بی این ٹائمز، گلبرگہ ۱۳ راکتوبر ۲۰۰۸

احتساب

قدیر زماں اردو فکشن کی دنیا کا مشہور نام ہے۔ ان کے افسانے معیاری اردو رسائل کی زینت بنتے رہے ہیں۔ افسانوی مجموعے شائع ہوکر مقبول بھی ہو چکے ہیں۔ حیدرآباد کے ادبی حلقوں سے ان کے مراسم خوشگوار ہیں۔ ان کی خوش مزاجی، حسن سلوک اور خلوص کی وجہ سے ان کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع ہے اور یہ دوست بنانا بھی خوب جانتے ہیں۔ اس بار انہوں نے افسانوں کی نہیں اپنے دوست احباب پر لکھی ہوئی کتاب چھپوائی ہے۔ کتاب کا نام رکھا ہے ''بزم ارباب نظر''!

زیر تبصرہ کتاب کی پیشانی پر ''سوانحی انشائیے'' لکھا گیا ہے۔ یہ وضع کردہ اصطلاح کچھ غیر مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اس کی جگہ خاکے بھی لکھا جاتا تو بھی مناسب نہیں تھا کیوں کہ مشمولات خاکوں کی تعریف میں نہیں آتے، یہ تو مضامین ہیں جو حقیقی کرداروں پر لکھے گئے ہیں تو انہیں نہ افسانہ کہا جاسکتا ہے اور نہ انشائیہ اس لئے ٹائٹل کے نیچے کچھ بھی نہیں لکھا جاتا تو بہتر تھا۔ یہ قدیر زماں کا خلوص ہے کہ انہوں نے دوستوں اور ملنے جلنے والوں پر مضامین لکھے اور بہت ہی اچھے مضامین لکھے ہیں۔ ہر مضمون شخصیت کے مخصوص پہلو کو قاری سے روشناس کرتا ہے اور قاری اس

پہلو سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زبان کی سادگی اور بیان کی شگفتگی کی وجہ سے قاری پورا مضمون پڑھے بنا نہیں رہ سکتا۔ میں نے بھی وقفے وقفے سے سارے مضامین پڑھے ہیں اور قدیر زماں کے ملاقاتیوں کو تصور کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ یہ سارے کردار زندگی کے عام اور معمولی کرداروں سے الگ ہیں، انہیں غیر معمولی بھی کہا جاسکتا ہے، ان کرداروں میں کافی دم خم ہے۔ اس لئے یہ افسانوں کے بھی کردار بن سکتے تھے لیکن قدیر زماں نے انہیں افسانوں میں سمونا مناسب نہیں سمجھا۔ شاید اس لیے کہ ان مضامین کے کرداروں کے ساتھ ساتھ قدیر زماں کا بھی کردار چلتا ہے۔ ان دونوں کرداروں کے ملن سے ہی ان مضامین میں بات بنی ہے۔

قدیر زماں نے جن شخصیات پر یہ مضامین لکھے ہیں وہ بھی اپنے اپنے فن میں ماہر ہیں اور مشہور بھی ہیں اس اعتبار سے ان مضامین کی اہمیت ہے۔ آئزک سیکوئرا، احمد جلیس، یم راما کرشنیا رفیعہ سلطانہ، سراج الدین، شیخ امام، عالم خوندمیری، قادر علی بیگ، ، مغنی تبسم، نرسنگ راؤ بورگل، وحید اختر، وہاب عندلیب، اور ہاشم علی اختر جیسی شخصیات پر کون پڑھنا نہیں چاہے گا۔ قاری ان مشہور شخصیات کے بارے میں جاننا چاہے گا۔ قاری کی دلچسپی پہلے سے ہی جب ان شخصیات سے ہے تو مصنف کی جیت یہیں سے شروع ہوتی ہے اور قاری جب پڑھتا چلا جاتا ہے تو مصنف جیت کے ریکارڈ قائم کرنے لگتا ہے۔ تبصرے کے حدود اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ان مضامین پر کھل کر بات چیت کی جائے، کرداروں کی کرداریت کے اندرونی اور بیرونی احساسات کو قلم بند کیا جائے اور ان کرداروں کے ساتھ جو مصنف کا کردار ہے اس پر بات کی جائے۔ اس لئے کچھ مضامین کے اقتباسات دیے جارہے ہیں تاکہ اس بات کا اندازہ ہوجائے کہ قدیر زماں کا اسلوب نگارش کیا ہے اور کیسا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

''معلوم نہیں کہ بچے جلیس کو ان کی طرف دیکھتے ہوئے کیسا محسوس کرتے لیکن کبھی کبھی جب وہ بڑوں کو دیکھتے تو ان کے چہرے کی ساخت اور زلفوں کا انداز اور ان کی اپنائیت بھری آنکھیں دیکھ کر شاید بڑے یہ محسوس کرتے کہ وہ جلیس کی آنکھوں

سے خود اپنے آپ کو دیکھ رہے ہیں۔'' (احمد جلیس۔ ایک ہمہ گیر شخصیت)

''پروفیسر آئزک سیکوئرا کے بارے میں اگر میں ''ایک بے مثال انسان'' کا عنوان لگاتا تو تب بھی یہ عنوان موزوں ہوتا۔ پھر خیال ہوا کہ کسی بھی شخص کے ہاتھوں کی ریکھائیں دوسرے شخص کی ریکھاؤں سے نہیں ملتیں، اسی طرح لوگوں کی آوازیں بھی ایسی مختلف ہوتی ہیں کہ ایک کی آواز دوسرے کی آواز سے نہیں ملتی۔ ہمارے اخلاق، عادات واطوار اور رویے بھی الگ الگ ہیں۔ صورتیں ہماری شناخت اور پہچان ہیں''۔

(آئزک سیکوئرا۔ ایک بے بدل دوست)

''وہاب صاحب اپنے دوستوں کی خامیوں کو درگزر تو کردیتے ہیں لیکن انہیں آگاہ کرنے سے نہیں چوکتے، اس اپنائیت کے ساتھ وہ کہہ دیتے ہیں کہ جیسے وہ خامی ان کی اپنی ہو اور اس پر قابو پالینا چاہئے۔ یہ وصف بڑی ریاضت کے بعد ہی کسی کو حاصل ہوسکتا ہے''۔ (وہاب عندلیب۔ ایک مسیحا)

''ہمارے مرحوم دوست عوض سعید نے مغنی تبسم پر خاکہ لکھا تو ایک واقعہ کا خاص طور پر ذکر کیا، وہ جب مغنی صاحب کے گھر گئے تو مغنی صاحب مکمل سوٹ میں ملبوس کرسی پر بیٹھے ہوئے پائے گئے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کہیں جارہے ہیں، جواب ملا نہیں، پھر پوچھا کہیں سے آرہے ہیں؟ دوبارہ جواب ملا نہیں، اس کے بعد عوض سعید گھر لوٹ گئے اور سوچنے لگے کہ شعر وحکمت کے بند ہونے کا سبب یہی ہوگا''۔ (مغنی تبسم۔ چیزے دیگر است)

اس کتاب میں حقیقی شخصیتوں کے عادات واطوار شوق وذوق، کمزوریوں اور خوبیوں کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف کے ان سے روابط اور تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ کچھ باتیں کچھ واقعات اس کتاب میں ایسی ہیں کہ ان کے ایک کردار کے ایک واقعہ کو پڑھ کر کئی کردار اور

کئی واقعات یاد آجاتے ہیں اور کچھ باتیں قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ بہرحال قدیر زماں کے مضامین کا یہ مجموعہ اپنے طرز اور اپنی نوعیت کا الگ عمدہ مجموعہ ہے۔ قیمت واجبی اور طباعت روشن ہے۔ کتابت عمدہ اور ٹائٹل خوبصورت ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

رفیق جعفر

اشاریہ

آ ۔ ا

❖❖❖

مصنف کی دیگر تصانیف

افسانے

راتت کا سفر 1976

ادھورا سفر 1992

کھلونے والا 2005

ڈرامے

پنجرہ کا آدمی 1976

ماوراء 1996

تحقیق و تنقید

تلاش اقبال 2000

تصوف بہ یک نظر 2005

انشائیہ

بزم ارباب نظر 2007

سوئے انشائیہ اور سوانحی انشائیے 2009

تراجم (انگریزی سے)

ادبی نگارشات 2004

(بعض مغربی و مشرقی شہ پاروں کے منتخب تراجم)

الف روپوشی کی تحریریں (سوانحی نوٹ) دوستوفسکی

ب ایڈی پس (ڈرامہ) سوفکلیس

ج زوا سٹوری (ڈرامہ) اڈورڈ ایلی

د داریوفو کی تحریریں ۔ اٹلی کا ڈرامہ نگار

(الف) تا (ج) کی نگارشات جو پہلے بھی شائع ہو چکیں تھیں ادبی نگارشات کے تراجم میں بھی شامل ہیں۔)

وینا ۔ (وی آر نارل) ساہتیہ اکاڈمی ۔ دلی 1993

پرچھائیں ۔ (ایتا ذگوش ۔ ناول) ساہتیہ اکاڈمی ۔ دلی 1997

اردو کی تعمیر نو (مضامین) قومی کونسل دلی ۔ زیر اشاعت 2007

اپنا گھر (Home Coming) ہیر الڈ پنٹر (غیر مطبوعہ) 2007

انگریزی

1. *Landmarks of Cooperative Movement in India* - 1976
2. *Judiciary - the Last Hope* (Case Study) - 1989
3. *Silence is Crime* (Seminar events held by the forum for modern thought from 1981 - 1991)
4. *Bribery* (Expriences) - 1997
5. *Face to Face* (Case Study) - 2006

اشاعتوں سے متعلق دیگر کاوشیں

''سفینہ'' دو شمارے اردو اسوسی ایشن جامعہ عثمانیہ کے صدر کی حیثیت سے 1960ء میں شائع کیے۔

Sahayog انگریزی رسالہ کوآپریٹیو ٹریننگ سنٹر راجندر نگر ۔ ادارت و اشاعت

Seminar articles on Modern thought & Contemporary Literary Trends - Edited & Published - 1981.

جدید فکر و عصری ادبی رجحانات (تراجم) ۔ 1982

تاریخ یورپ دور جدید (سید علی محسن) ۔ 1985

ہندوستانی مسلمان منزل کی تلاش میں ۔ 2003 (سید ہاشم علی اختر)

Secularism, Islam and Modernity (Collected essays of Alam Khundmiri) Sage Publication India - 2001

چیانو کی ڈائریز (مترجم سید علی محسن) ۔ 2009

ادارہ جدید فکر و ادب کی اشاعت

SOO-E-INSHAIYA
AUR
SAWANEHI INSHAIYE

KADIR ZAMAN

Forum for Modern Thought & Literature

ISBN : 81-900-859-8-0

الف: ''اس کا سبب وقت کا جبر ہے جو اپنے دور کو منوانے کا ہے۔ اپنے اس جبر سے وہ باخبر ہو کہ نہ ہو ہم اس قدر جانتے ہیں کہ وہ لامتناہی ہے اور خود اپنے ان ہی واقعات کی نشانی چھوڑ جاتا ہے جو سیاروں کی شکل میں کائنات پر حاوی ہیں۔ باقی ہوس ہے جس کی لَے پر ہم زندہ ہیں۔''

ب: ''اسی دور میں شہنشاہ اکبر کے ایک نورتن ابوالفضل کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس نے شہنشاہ کی طرف سے جو رقعات لکھے اور اپنی یادداشتوں کا ایک دفتر تیار کیا تو انہیں ''انشائے ابوالفضل'' کہا گیا۔ یہ فارسی میں تھے مونٹین کی پیدائش ۱۵۵۳ء کی ہے اور ابوالفضل اُس سے دو سال بڑا تھا۔''

ج: ''آنکھ کو آپ چاہیں تو آئینہ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مگر نہیں! آئینہ میں تو صرف باہر کی چیزیں منعکس ہوتی ہیں۔ آنکھ تو جام جہاں نما کی طرح ہے کہ اس میں لمحہ بہ لمحہ نئے نئے عکس پیدا ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ سارے عکس باہر سے آئے ہوئے ریزوں یا آبدار شعاعوں سے منعکس نہیں ہوتے بلکہ از خود اندر کے ''ناموجود'' سے ابھرتے ہیں۔''

د: اختر صاحب نے اردو کے بہترے شعر سنائے۔ فارسی کی چند غزلیں بھی سنائیں۔ میری خواہش پر انہوں نے عثمان ہارونی کی اور حافظ کی ایک ایک غزل بھی لکھ کر دی۔ عثمان ہارونی کی غزل کا ایک بہت ہی مقبول شعر ہے۔

تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خون من ریزی
من آں بسمل کہ زیر خنجر خونخوار می رقصم

AL- ANSAR PUBLICATIONS
HYDERABAD - 500 059
Cell: 9391301192